کائنات نظریۂ وقت

اور تقدیر

TIMELESSNESS AND THE REALITY OF FATE



ہارون یحییٰ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کائنات، نظریۂ وقت اور تقدیر

TIMELESSNESS AND THE REALITY OF FATE

مصنف : ہارون یحییٰ

مترجم : ارشد علی رازی

نظرثانی : سعود عثمانی

اسلامک ریسرچ سینٹر۔ پاکستان

فہرست

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

جو تتلیوں کے پروں پر بھی پھول کاڑھتا ہے
یہ لوگ کہتے ہیں اس کی کوئی نشانی نہیں

عہد موجود خواب اور خبر کی یکجائی کا بلکہ صحیح تر معنوں میں انسان کی بے خبری کے اعتراف کا دور ہے۔ بیسویں صدی اور بالخصوص اس کے آخری ربع میں انسان کی تیز رفتار علمی پیش قدمی اور وسیع ہوتی ہوئی معلومات نے انسان کی لاعلمی کو مزید اجاگر کر دیا ہے۔ گزرتا ہوا ہر پل ان کڑیوں کو باہم مربوط کر رہا ہے جو ایک عظیم ڈیزائنر اور لازوال خالق کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ایک عظیم معمے (JIGSAW PUZZLE) کی طرح معلومات کے ٹکڑے اس تصویر میں اپنی اپنی جگہ تیزی سے بیٹھ رہے ہیں جو خاک کے حقیر ترین ذرّے کے باطن سے لے کر کہکشاؤں کے پیچیدہ نظام تک کو محیط ہے۔ جدید ترین سائنسی اکتشافات وایجادات ہر آن خالق کائنات کی نشانیوں کو انسان کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔ کھلتی ہوئی ہر پرت اور اترتا ہوا ہر غلاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ یہ بے مثال نظام اس سے کہیں عمیق اور کہیں پیچیدہ ہے جتنا انسان ابتدا سے سمجھتا تھا۔ اس حیرت سرا میں کھلنے والا ہر دروازہ ایک نئے جہان کی خبر دیتا ہے اور اس اعتراف کے بنا کوئی چارہ نہیں کہ انسان ابھی اس جہان کی صرف دہلیز پر کھڑا ہے۔

"کائنات، نظریۂ وقت اور تقدیر" (Timelessness and The Reality of Fate) اسی حیرت سرا کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہے۔ اپنے موضوع پر یہ انتہائی خوبصورت اور بے مثل کتاب ہمارے ادارے سے شائع ہونے والی ہارون یحیٰی کی دوسری کتاب ہے۔ اردو زبان میں ان موضوعات پر جو کام اب تک ہوا تھا وہ یا تو ان حضرات کی تحریروں پر مبنی تھا جو سائنسی علوم سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تھے یا سائنس کے ان معتقدات پر مشتمل تھا جنہیں خود سائنس چھوڑ کر یا ان کی بنیاد پر عمارت استوار

کر کے آگے بڑھ چکی ہے۔ ایسے میں ہارون یحییٰ کی یہ تصانیف اسلامی کتب کی دنیا میں ایسا وقیع اضافہ ہیں جن کی مثال کم از کم اردو ذخیرے میں دستیاب نہیں ہے۔ ان کتب کی خصوصیات میں مصنف کا مضبوط عقیدہ' طریقہ ء استدلال' جدید ترین علوم تک رسائی اور پر تاثیر انداز بیان وہ عناصر ہیں جنہوں نے ان کتب کو غیر معمولی حیثیت دے دی ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ مصنف کی جانب سے خصوصی اجازت کے بعد ہمیں ان کتب کے اردو' انگریزی ایڈیشن پاکستان میں طبع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ ہماری بھرپور کوشش رہی ہے کہ یہ کتب بین الاقوامی معیار طباعت پر شائع کی جا سکیں اور الحمد للہ تر جمے' کاغذ' طباعت اور جلد بندی کے شعبوں میں یہ کاوش نمایاں طور پر کامیاب نظر آتی ہے۔ یہ معیار اسلامی کتب میں پہلی بار حاصل کیا گیا ہے اور ہمیں اس میدان میں اولیت کا شرف حاصل کرنے کی بے حد مسرت ہے۔ ان کتب میں جدید طرز تفہیم اور موضوع کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مصنف نے جا بجا تصویروں، نقشوں اور خاکوں کے ذریعے بات واضح کی ہے۔ یہ انداز یقیناً موضوع تک کامل رسائی میں مفید اور مددگار ہوتا ہے۔ ان تصاویر وغیرہ میں سے جو بے جان اشیاء پر مشتمل ہیں' ان سب کو موجودہ اردو ایڈیشن میں برقرار رکھا گیا ہے۔ دیگر تصاویر وغیرہ کے بارے میں کئی ایک صاحب الرّائے حضرات سے متعدد بار مشوروں کے بعد یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ جو تصاویر ناگزیر نہیں تھیں (مثلاً سائنس دانوں کی تصاویر) انہیں شامل نہیں کیا گیا اور جن تصاویر کے بارے میں یہ محسوس ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں کتاب کی افادیت متاثر ہوگی اور بات سمجھنے میں مشکل پیش آئے گی انہیں شامل رکھا گیا۔ چونکہ اس کا مقصد صرف حقائق کو درست طور پر سمجھنا اور سمجھانا ہے اس لئے امید ہے کہ اسے اسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے گا۔

ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف' مترجم اور ناشرین کی اس کوشش کو قبول اور مقبول فرمائے اور اس میں موجود کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین

ناشرین

تعارف

تاریخ میں خلاف مذہب لوگوں اور رجحانات کے طائرانہ جائزے پر فلسفیانہ اصطلاح میں بات کی جائے تو انہیں مادیت پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مادیت پرست مسلمہ طور پر تخلیق کی حقیقت کو ماننے سے انکاری ہیں۔ اس کی بجائے وہ کہتے ہیں کہ مادہ ابد سے موجود ہے اور یہ بطور مطلق شے کے تا ابد موجود رہے گا۔ بالالفاظ دیگر وہ مادے کو درجہ معبودیت دیتے ہیں۔ اُن کے اپنے مآخذ وجودیت کی یوں تعریف کرتے ہیں "مادیت دنیا کی ہمیشگی اور دوام کو تسلیم کرتی ہے۔ ہمیشگی سے مراد یہ ہے کہ اس کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ اختتام اور یہ کہ اِسے خدا نے پیدا نہیں کیا اور یہ زمان و مکان میں لامحدود ہے"۔ مادیت پسندوں کے مادے پر اس قدر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خالق کائنات کے وجود کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ اگر مادے کی ابتداء کو مان لیا جائے تو اس کے مضمرات میں سے ایک یہ ہوگا کہ کوئی وقت ایسا تھا جب مادہ وجود میں آیا تھا اور کوئی خالق اِسے وجود میں لایا تھا۔

بیسویں صدی کے اختتام پر ساری سائنسی برادری نے تسلیم کر لیا کہ مادہ مطلق نہیں بلکہ اِس کا ایک نقطۂ آغاز ہے۔ کوئی پندرہ بلین سال پہلے "صفر" حجم کا ایک نقطہ پھٹا اور متواتر پھیلتے پھیلتے اس نے موجودہ کائنات کی شکل اختیار کر لی۔ اس واقعہ کو بگ بینگ (Big Bang) کا نام دیا جاتا ہے۔ نظری طبیعات (Theoretical Physics) کے تخمینہ جات اور مشاہدات و تجربات سے اس نظریے کی تصدیق ہوتی ہے۔

آج سائنس کا جدید ترین نقطۂ نظر یہ ہے کہ "کائنات لاشے سے وجود میں آئی" یہی بات قرآن اور تمام مذاہب بیان کرتے ہیں۔ مزید برآں جدید سائنس نے مادیت اور اس کے ذیلی

نظریات کو مسترد کر دیا ہے اور یوں مادیت پسندوں کی تخلیق کے خلاف جنگ اُن کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔

تاہم مادیت پسندوں کو یہ امر قبول کرنے میں تامل ہے کہ مادہ مطلق نہیں اور کائنات تخلیق کی گئی ہے۔ اپنی اس ہٹ دھرمی میں انہوں نے سائنس میں تضادات پیدا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس حقیقت کا تسلیم کرنا وجود خداوندی پر ایمان کا متقاضی ہے اور اللہ پر ایمان لانے کی صورت میں مذہب کو تسلیم کر کے اُس پر عمل کرنا ضروری ہو جائے گا۔ لیکن مذہب بنیادی طور پر احکام خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے۔ اپنے غرور سے مغلوب لوگوں کے لئے یہ عمل خاصا تکلیف دہ ہے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کی حالت بیان کی گئی ہے جو حقیقت کو دیکھتے جانتے ہوئے بھی اپنے غرور کے باعث حقائق سے فرار اختیار کرتے ہیں۔

مادیت پسند وقت کو بھی مادے کی طرح مطلق جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی انتہا نہیں یہ دائمی ہے ہم سے پہلے بھی یہ لا ابد تھا اور ہمارے بعد بھی یہ لا ابد تک موجود رہے گا۔ اسی مسخ شدہ ادراک کے بل بوتے پر وہ مقدر، دوبارہ اٹھائے جانے کے دن، بہشت اور دوزخ کے منکر ہیں۔ تاہم جدید سائنس نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ وقت، جو مادے ہی سے مشتق ہے، لاشے سے وجود میں لایا گیا ہے۔ اور یہ کہ اس کا ایک نقطہ آغاز ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ وقت حرکت کی اضافیت ہے۔ مادیت پسندوں کے دعووں کے برعکس وقت ساکن ہے اور نہ ہی غیر متغیر۔ یہ دراصل ادراک کے مسلسل تغیر سے جنم لینے والا احساس ہے۔ اس صدی میں آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے زمان و مکان پر ہمارے ادراک میں معتد بہ اضافہ کیا ہے۔ آج کی جدید طبیعات کی بنیاد اس نظریے پر ہے۔

اسی بات کو اجمالاً بیان کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ زمان و مکان مطلق نہیں۔ ان کا ایک نقطہ آغاز ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں لاشے سے پیدا کیا ہے۔ اور زمان و مکان کا مالک اللہ ان پر انحصار نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے ابدیت میں وقت کے ہر لمحے کو تبدیل کیا، اُس کا تعین کیا اور اُس کی توضیح کی۔ اسی سے روحِ مقدر کی وضاحت ہوتی ہے جسے مادیت پرست سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔

واقعات جو ہم پر ماضی میں وارد ہوئے اور جن کا مشاہدہ ہم مستقبل میں کریں گے سب خدائے بزرگ و برتر کے علم اور اس کے دست قدرت میں ہیں۔ اور وہ جس نے وقت کو لاشے سے

پیدا کیا اس پر انحصار نہیں کرتا۔

آج کی جدید سائنس چودہ سو سال پہلے قرآن کے بیان کردہ حقائق کی تصدیق کرتی ہے۔ تمام اہل ایمان ان کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف سائنس مادیت پسندوں کے تمام دعووں کو جھٹلا رہی ہے حالانکہ صدیوں انہوں نے اپنی کج بحثی کے لئے سائنس سے دلائل تلاش کئے اور اس میں پناہ ڈھونڈتے رہے۔ ہمیں اس کتابچے میں بزور ثبوت یہ بیان کرنا ہے کہ مادیت پسندوں کے ادعا کی کوئی منطقی اور سائنسی بنیاد موجود نہیں بلکہ اس کے برعکس معاصر سائنس نے مادیت کو کلی طور پر تباہ کر دیا ہے۔ اس کتاب میں مادے کی حقیقت اور زمان و مکان کی اضافیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ آپ کا چند ایسے حقائق سے واسطہ پڑے گا جن پر آپ نے اس سے پہلے کبھی غور نہ کیا ہوگا۔ اور آپ کو پتہ چلے گا کہ درحقیقت مادے کی ماہیت و نوعیت وہ نہیں جیسا کہ مادیت پسند اب تک بیان کرتے رہے ہیں۔

حصّہ اوّل

کائنات کو عدم وجود سے تخلیق کیا گیا

مادیت ایک ایسا نظام ہے جس میں مادے کو مطلق وجود خیال کیا جاتا ہے اور سوائے مادے کے کسی بھی چیز کے ہونے سے انکار کیا جاتا ہے۔ اس نظریے کی جڑیں قدیم یونانی فلسفے میں ہیں۔ انیسویں صدی میں اس کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی اور بالآخر کارل مارکس کی جدلیاتی مادیت کی شکل اختیار کر گئی۔ اس نظام فکر کا دعویٰ ہے کہ مادہ دائمی ہے، یہ ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ چونکہ یہ مادے کے پیدا کئے جانے پر یقین نہیں رکھتے اس لئے یہ خالق کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا مادیت انیسویں صدی میں اپنی مقبولیت کے عروج پر تھی۔ اس کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ "ساکن کائنات" کا وہ خاکہ تھا، جسے کائنات کے وجود میں آنے کے سوال کے جواب کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس خاکے کی رو سے چونکہ کائنات دائمی ہے یعنی اس کا کوئی آغاز ہے نہ کوئی انجام، اس لئے اس کے وجود میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ مان لیا گیا کہ کائنات مادے کا مستقل، مستحکم اور غیر متغیر مجموعہ ہے اس لئے یہ اپنی پیدائش کے لئے کسی خالق کی متقاضی و محتاج نہیں۔

اس صدی کی دوسری دہائی میں مشاہدات نے ثابت کیا کہ کائنات ساکن نہیں اور اس کا ایک نقطہ آغاز ہے۔ اس دریافت نے خالق کائنات کی موجودگی کا سوال بھی اٹھایا۔ مادیت پسند فلسفے کے معروف مفکر جارج پولٹزر (George Politzer) نے اپنی (Princepes Fondamentaause de Philosphie) میں اس حقیقت کو یوں تسلیم کیا ہے:

"کائنات ایک پیدا کیا گیا وجود نہیں۔ اگر ایسا ہے تو اسے خدا نے پیدا کیا ہوتا اور وہ اسے

لاشے سے وجود میں لایا ہوتا۔ تخلیق کو ماننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ طے کر لیا جائے کہ ایک لمحہ تھا جب کائنات موجود نہیں تھی اور کوئی شے لاشے سے وجود میں آئی تھی۔ یہ ایک ایسا امر ہے جسے سائنس تسلیم نہیں کرتی"۔

کائنات کا پھیلاؤ

۱۹۲۹ء میں کیلیفورنیا کی ماؤنٹ ولسن رصد گاہ میں امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل (Edwin Hubble) نے جو حقیقت دریافت کی اُسے فلکیات کی عظیم ترین دریافتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ بہت بڑی دوربین سے ستاروں کا مشاہدہ کرتے ہوئے اُسے پتہ چلا کہ اس سے آنے والی روشنی طیف (Spectrum) کے سرخ سرے کی طرف تحویل ہوتی ہے۔ کوئی ستارہ جتنا دور ہے اس تحویل کی شرح اتنی ہی نمایاں ہے۔ اس دریافت نے سائنسی حلقوں میں ہلچل مچا دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمہ سائنسی اصولوں کی رُو سے اگر روشنی کا سرچشمہ مشاہدہ کرنے والے کی طرف بڑھ رہا ہو تو اس سے خارج ہونے والی شعاعوں کو الٹرا وائلٹ (Ultra Violet) سرے کی طرف تحویل ہونا چاہئے۔ اس کے برعکس اگر یہ سرچشمہ مشاہدہ کرنے والے سے دور ہٹ رہا ہو تو اس سے نکلنے والی شعاعوں کو سرخ سرے کی طرف تحویل ہونا چاہئے۔ ان معلومات کی روشنی میں ہبل کے مذکورہ بالا مشاہدے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کائنات ہم سے دور ہٹ رہی ہے۔

اس کے فوراً بعد ہبل نے ایک اور دریافت کی۔ ستارے اور کہکشائیں صرف ہم سے نہیں بلکہ ایک دوسرے سے بھی دور ہٹ رہی ہیں۔ جس کائنات میں سب چیزیں ایک دوسرے سے دور ہو رہی ہوں اُس کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلسل پھیل رہی ہے۔ اس تصور کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ایک غبارے کا تصور کریں جس کی سطح پر نقطے بنے ہوئے ہوں۔ جب غبارہ پھلایا جائے گا تو یہ نقطے ایک دوسرے سے دور ہٹیں گے۔ کہکشائیں بھی ان نقطوں کی طرح ایک دوسرے سے دور ہٹ رہی ہیں۔



ہبل اپنی دیو قامت دوربین کے سامنے

ہبل کے مشاہدے اور دریافت سے بھی پہلے آئن سٹائن یہی حقیقت نظری (Theoretically) دریافت کر چکا تھا۔ البرٹ آئن سٹائن نے اپنے نظریۂ اضافیت کے لئے جو ریاضیاتی مساواتیں بنائیں اُن کی رُو سے کائنات ساکن نہیں ہو سکتی۔ آئن سٹائن اپنی اس دریافت پر خود بھی حیران ہوا۔ اُسے اس اَن چاہے نتیجے سے بچنے کے لئے اپنی مساوات میں کائناتی مستقل شامل کرنا پڑا۔ اُس وقت کی فلکیات کے مطابق کائنات ساکن تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا نظریہ ساکن نظریات کے خاکے سے متصادم ہو۔ آئن سٹائن نے کائنات پر اپنا نظریہ واپس لے لیا۔ وہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کہتا تھا۔

۱۹۲۲ء میں پہلی مرتبہ روسی سائنسدان الیگزینڈر فریڈمین (Freidmann) نے نظریۂ اضافیت کی بنیاد پر دریافت کیا کہ کائنات ساکن نہیں اور اس میں سکڑاؤ یا پھیلاؤ آ سکتا ہے۔ اپنے نتائج پیش کرتے ہوئے فریڈمین نے آئن سٹائن کے مضمون مطبوعہ ۱۹۱۷ء میں اس کے کائناتی مستقل (UNIVERSAL CONSTANT) کی تصحیح بھی کی۔

بلجیم کے سائنسدان جارج لیمر (George Lemaitre) نے ان نتائج کی بنیاد پر پہلی بار یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کائنات کا ایک لمحۂ آغاز بھی تھا اور اپنے اس آغاز کے بعد سے یہ متواتر پھیل رہی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آغاز کے وقت جو شعاعیں خارج ہوئی تھیں انہیں شناخت کیا جا سکتا ہے۔ ان شعاعوں کو کائناتی پس منظری شعاعوں (Cosmic Background Radiations) کا نام دیا گیا۔ اور یہ بعد میں دریافت بھی ہو گئیں۔

بگ بینگ کی دریافت

پھیلتی ہوئی کائنات کا نظریہ صدیوں سے مانے جانے والے ساکن کائنات کے نظریے سے متصادم ہے۔ اس نظریے کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر اجرام فلکی کو ان کے راستوں پر پیچھے دھکیلا جائے تو وہ واپس اُسی مقام پر اکٹھے ہو جائیں گے جہاں سے وہ شروع میں چلے تھے۔

ریاضی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ واحد نقطہ جس میں کائنات کا سارا مادہ مجتمع تھا "صفر حجم" اور "لا انتہا کثافت" کا حامل تھا۔ کائنات صفر حجم کے اس نقطہ واحد کے پھٹنے سے وجود میں آئی تھی۔ پھٹنے کے عمل کو بگ بینگ کا نام دیا گیا۔ اس سے متعلقہ نظریہ بھی "بگ بینگ نظریہ" کہلانے لگا۔

بگ بینگ کی شہادت
سرخ کی طرف تبدل یا تحویل
کہکشاؤں کی روشنی میں



جب کسی دور ہوتے ہوئے جسم کا طیف زیر مشاہدہ لایا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی سرخی بڑھتی جارہی ہے۔ زمین سے کیے جانے والے مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ کہکشاؤں اور ستاروں کی طیفوں میں سرخ تبدل بڑھتی ہوئی شرح کے ساتھ موجود ہے۔ یہ دریافت ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ کائنات کی ساخت ہر لحظہ مائل بہ پھیلاؤ ہے اور یہ بگ بینگ سے شروع ہوئی تھی۔

ممکن ہے کہ آپ حیران ہوں کہ صفر حجم، یعنی کوئی جگہ نہ گھیرنے والا اور لامحدود کثافت کا حامل یہ نقطہ کیسے موجود ہو سکتا ہے۔ دراصل ''بے حجم اور لامحدود کثافت'' کی اصطلاح نظری طبیعات میں اس حقیقت کے اظہار کا مستند طریقہ ہے۔ سائنس میں جب صفر حجم کہا جاتا ہے تو مطلب ہوتا ہے کہ بغیر کسی حجم کے نقطہ۔ جب کسی نقطہ کا حجم موجود نہیں تو اصلاً اس کا مطلب ہے نقطہ جو در حقیقت موجود نہیں۔ چنانچہ اس نظریے کی رُو سے کائنات ''لاوجود'' سے ''وجود'' میں لائی گئی تھی۔ یہ نظریہ مادیت پرستوں کے اس نقطہ نظر کی تردید کرتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود تھی۔

''استقراری حالت'' آزمائش

جو ماہرین فلکیات مادیت پسندانہ رجحان کے حامل تھے، بگ بینگ کے خلاف تل گئے اور ''استقراری حالت'' کی کائنات کا نظریہ سامنے لے آئے۔ اس کا مقصد سمجھنے کے لئے اے ایس ایڈنگٹن (A.S.Eddington) کے ذیل کے الفاظ کافی ہیں:

''کائنات کے اچانک پھٹ کر سامنے آنے کے فلسفیانہ مضمرات مجھے گوارا نہیں''۔

مشہور عالم ریاضی دان اور ماہر فلکیات سر فریڈ ہائل (Sir Fred Hoyle) بھی بگ بینگ سے مضطرب ہو جانے والوں میں شامل تھا۔ اس صدی کے وسط میں فریڈ ہائل نے کائنات کا استقراری حالت کا نظریہ پیش کیا جو کم از کم فلسفیانہ مضمرات میں انیسویں صدی کے ''مستقل کائنات'' کے نظریے کا سا تھا۔ اگرچہ اس نے بھی کائنات کا متواتر پھیلنے کا عمل تسلیم کیا لیکن اس نے دلیل دی کہ کائنات ابدی ہے اور اس کا حجم بھی لامحدود ہے۔ اس نے نظریہ پیش کیا کہ جب کائنات پھیلتی ہے تو ضرورت کے مطابق مادے کی مطلوبہ مقدار از خود پیدا ہونے لگتی ہے۔ واضح نظر آتا ہے کہ یہ نظریہ محض اس لئے پیش کیا گیا کہ مادے کو ''ازل سے موجود'' ثابت کرتے ہوئے بگ بینگ کو رد کیا جا سکے۔ اس نظریے کا دفاع کرنے والوں نے ایک لمبی مدت تک بگ بینگ کی مخالفت کی۔ تاہم سائنس کا دھارا اس نظریے کے خلاف بہہ رہا تھا۔

بگ بینگ کا ایک نیا ثبوت: کائناتی پس منظری شعاعیں

۱۹۴۸ء میں جارج گیمو (George Gamow) نے بگ بینگ کے حوالے سے ایک اور نظریہ پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ بگ بینگ سے کائنات بنتے وقت توانائی کی ایک فاضل مقدار

شعاعوں کی صورت بچ نکلنا چاہیے تھی۔ اس نے مزید کہا کہ اس توانائی کو پوری کائنات میں یکساں شدت کے ساتھ موجود ہونا چاہیے۔

یہ ثبوت جو جارج گیمو (George Gamow) کے خیال میں موجود ہونا چاہیے تھا بالآخر دریافت ہو گیا۔ ۱۹۶۵ء میں دو محققین آرنو پینزیز (Arno Penaizs) اور رابرٹ ولسن (Robert Wilson) نے یہ شعاعیں دریافت کر لیں۔ یہ شعاعیں، جنہیں پس منظری کائناتی شعاعیں، کا نام دیا گیا اُن شعاعوں سے خصوصیات میں مختلف تھیں جو کائنات کی کسی خاص سمت سے زمین کی طرف آتی ہیں اور ان کی خصوصیات متواتر بدلتی رہتی ہیں۔ یہ شعاعیں اپنی شدت میں غیر معمولی طور پر یکساں تھیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ شعاعیں زمین سے باہر کسی خاص منبع سے خارج نہیں ہو رہی تھیں بلکہ تمام اطراف سے یکساں شدت کے ساتھ زمین پر پہنچ رہی تھیں۔ چنانچہ یہ سمجھ لیا گیا کہ تین ڈگری کیلون (Kelvin) (3°K) کی یہ شعاعیں دراصل بگ بینگ کی باقیات ہیں۔ ان کا درجہ حرارت اس مقدار سے بہت قریب تھا جس کی پیش گوئی سائنسدان بہت پہلے ریاضیاتی طریقوں سے کر چکے تھے۔ پینزیز (Penzias) اور ولسن (Wilson) کو نوبل انعام دیا گیا کہ انہوں نے بگ بینگ کا پہلا براہ راست ثبوت ڈھونڈا تھا۔

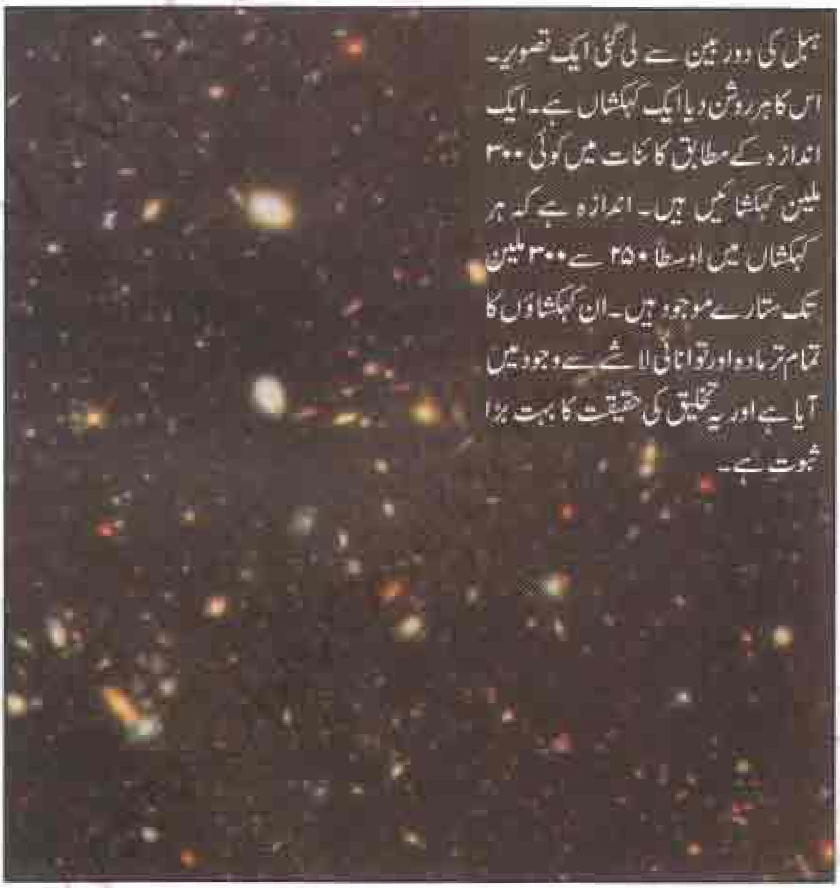
۱۹۸۹ء میں ناسا (NASA) کی ایک ٹیم نے جارج سموٹ (George Smoot) کی سربراہی میں ایک سیارہ کوبے (COBE) ''برائے دریافت پس منظری کائنات اشعاع کاری'' Cosmic Background Radiation Discovery خلاء میں بھیجا۔ اس سیارے نے کام شروع کرتے ہی آٹھ منٹ کے اندر اندر مذکورہ بالا دونوں سائنسدانوں کی پیمائشوں کی تصدیق کر دی۔ اس پر موجود آلات نے ان شعاعوں کی شناخت اور پیمائش کی جو بگ بینگ کی باقیات ہیں۔

اس دریافت کو عظیم ترین فلکیاتی دریافت کا نام دیا گیا۔ پہلے سیارے COBE-1 نے خلاء میں ان شعاعوں کے کسی ایک ممکنہ منبع کی امکانی پیش گوئی کی تھی۔ دوسرے سیارے COBE-2 نے ان شعاعوں کے درجہ حرارت میں فرق کی نشاندہی کی۔ یعنی ثابت کیا کہ اس کا درجہ حرارت دو مختلف نقاط پر مختلف ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بگ بینگ کے بعد اس شعاع کے درجہ حرارت میں وقت کے ساتھ تبدیلی آتی گئی۔

ایک اور شہادت، ہائیڈروجن-ہیلیئم ارتکاز
(Hydrogen-Helium Concentration)

بگ بینگ کے حق میں ایک اور شہادت کائنات میں ہائیڈروجن اور ہیلیئم کی تصاویر سے بھی ملی۔ حالیہ دور میں کی گئی ریاضیاتی تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس وقت کائنات میں ہائیڈروجن اور ہیلیئم کا باہمی تناسب اور کل مقدار وہی ہے جو بگ بینگ نظریے کے مطابق ہونا چاہیے۔

یہ ایک مستند حقیقت ہے کہ ستارے ہائیڈروجن کو ہیلیئم میں تحویل کرتے ہیں۔ یہ عمل نیوکلیائی تعاملات سے ممکن ہوتا ہے اور اس دوران بے تحاشا توانائی خارج ہوتی ہے۔ اگر کائنات ہمیشہ سے موجود ہوتی اور ماضی میں ایک خاص لمحہ پر وجود میں نہ آئی ہوتی تو ان میں موجود ساری ہائیڈروجن گیس ہیلیئم گیس میں تبدیل ہو چکی ہوتی۔ لیکن یہ حقیقت کہ ستاروں میں اب بھی



ہبل کی دوربین سے لی گئی ایک تصویر۔ اس کا ہر روشن دیا ایک کہکشاں ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق کائنات میں کوئی ۳۰۰ ملین کہکشائیں ہیں۔ اندازہ ہے کہ ہر کہکشاں میں اوسطاً ۲۵۰ سے ۳۰۰ ملین تک ستارے موجود ہیں۔ ان کہکشاؤں کا تمام تر مادہ اور توانائی لاشے سے وجود میں آیا ہے اور یہ تخلیق کی حقیقت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

ہائیڈروجن گیس متواتر ہیلیئم اور دوسرے بھاری عناصر میں تبدیل ہو رہی ہے اور وہ اس عمل میں پیدا ہونے والی توانائی کے باعث تاباں و درخشاں ہیں، اس امر کی دلیل ہے کہ کائنات لامحدود عرصے سے موجود نہیں بلکہ اس کا ایک آغاز و ابتداء تھی۔

بگ بینگ کی قبولیت

بگ بینگ (Big Bang) نظریے کے حق میں دلائل اتنے ٹھوس تھے کہ سائنسی برادری نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ کائنات کی تشکیل اور آغاز سے متعلقہ سائنس میں یہ اب تک کا جدید ترین نقطۂ نظر ہے۔ ساکن کائنات کے نظریے کا فریڈ ہائل (Fred Hoyle) اور اس کے ساتھ ڈینس شیاما (DENNIS SCIAMA) نے برسوں دفاع کیا۔ لیکن جب بگ بینگ نظریے کے حق میں حتمی اور فیصلہ کن نتائج سامنے آئے تو شیاما نے اپنے نقطۂ نظر سے دستبرداری کا اعلان کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ ساکن نظریے کے دفاع میں ایک طویل مباحثے کے پس منظر میں کائنات کو ساکن دیکھنے کی خواہش بھی شامل تھی۔ اس نے مزید کہا کہ پہلے پہل وہ ہائل (Hoyle) کا ساتھ دیتا رہا لیکن جب پھیلتی کائنات کے حق میں دلائل کے انبار لگ گئے تو اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ غلطی پر تھا۔ اور ساکن کائنات کے نظریے کو مسترد کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر جارج ایبل (George Abel) بیان کرتے ہیں کہ دستیاب شواہد کی روشنی میں کائنات نے کئی بلین سال پہلے بگ بینگ سے اپنا آغاز کیا۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سوائے بگ بینگ کو تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔

بگ بینگ کے نظریے کی فتح کے بعد ازلی مادے کا نظریہ، جس پر فلسفۂ مادیت کی بنیاد ہے، تاریخ کے کچرا گھر میں پھینک دیا گیا ہے۔ تو پھر وہ کونسی طاقت تھی جو بگ بینگ سے پہلے موجود تھی اور جو ایک بڑے دھماکے کے ذریعے کائنات کو عدم سے وجود میں لائی؟ اس سوال کے مضمرات کو آرتھر ایڈنگٹن (Arthur Eddington) نے بیان کرتے ہوئے مادیت کے لئے فلسفیانہ سطح پر غیر موافق قرار دیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ نظریہ اپنے اندر ایک خالق کے موجود ہونے کے مضمرات رکھتا ہے۔ معروف دہریہ فلسفہ دان انٹونی فلیو (ANTONY FLEW) اس مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"یہ بات بدنامی کی حد تک مشہور ہے کہ اعتراف روح کے لئے بہتر ہے۔ چنانچہ مجھے اس

اعتراف سے شروعات کرنا ہے کہ معاصر فلکیات میں اس نظریے پر جو اتفاق رائے پایا جاتا ہے اس نے مجھ جیسے دہریے کو سخت زِچ کیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جس چیز کو سینٹ تھامس فلسفیانہ طور پر ثابت نہیں کر سکتا تھا، فلکیات دان اُس کا ثبوت کائنات کے آغاز کے نظریے کی شکل میں سائنسی طور پر دے رہے ہیں۔ جب تک اسے ساکن مانا جاتا رہا تھا اس کے انجام اور آغاز کو کبھی زیر بحث نہیں لایا گیا۔ اور اس کے ٹھوس اور بے رحم وجود ہی کو اس کے موجود ہونے کا جواز مانا جاتا رہا۔ اگرچہ میں اب بھی اس نقطۂ نظر کو درست سمجھتا ہوں لیکن بگ بینگ نظریے کی موجودگی میں اس پر قائم رہنا آسان نہیں ہے''۔

بہت سے سائنسدان، جنھوں نے خود کو بلا سوچے سمجھے دہریہ نہیں بننے دیا، کائنات کی تخلیق میں کسی خالق کے کردار کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس خالق کو ایسا ہونا چاہئے جو مادے اور وقت کو پیدا کرے لیکن ان دونوں پر انحصار نہ کرتا ہو۔

مشہور ماہر طبیعات راجر پینروز (Roger Penrose) جس نے کائنات کے آغاز پر وقیع کام کیا ہے، کا کہنا ہے کہ کائنات جس حالت میں آج ہے بغیر کسی مقصدیت کے ایسی نہیں ہو سکتی۔ کچھ لوگوں کے نزدیک کائنات جیسی ہے اسے بس ایسی ہی ہونا تھا اور ایسی ہی رہنا ہے بس اتنا ہے کہ اس کے درمیان ہم خود کو موجود پاتے ہیں کیونکہ ایسا ہی ہے۔ لیکن یہ طرزِ فکر اور رویہ ہمیں کائنات کی تفہیم میں کسی طرح معاونت نہیں کر سکتا۔ پینروز کہتا ہے کہ کائنات میں کئی ایسے معاملات ہیں جو زیریں سطح پر ہو رہے ہیں لیکن ہم سردست اُن کا ادراک نہیں کر سکتے۔

چودہ سو سال پہلے قرآن کے بیان کردہ حقائق

فلکی طبیعات (Astrophysics) نے ماہرین کے جدید ترین نظریات کو مختصراً یوں بیان کیا ہے کہ کائنات بمع اپنے مادے اور وقتی ابعاد (Dimensions) کے وقت کے صفر لمحے پر ایک بڑے دھماکے یا بگ بینگ کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئی۔ بگ بینگ سے پہلے وقت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ مادہ، توانائی اور وقت ایک لاشے سے وجود میں آئے، لاشے کی اس حالت میں مادہ، توانائی اور وقت جیسی کوئی چیز موجود نہیں تھی چنانچہ ہم اس لاشے کو اپنی جانی پہچانی طبیعات کی اصطلاحات میں بیان نہیں کر سکتے۔ اس عظیم حقیقت کو انسان نے رواں صدی کے آخر میں دریافت کیا۔ لیکن قرآن اسے چودہ سو سال پہلے بڑے موثر انداز میں بیان کر چکا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ٥ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ٥

(وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے اور وہ بھید جاننے والا خبردار ہے۔ (اے محمدؐ ان سے کہہ دو) تمہارے (پاس) پروردگار کی طرف سے (روشن) دلیلیں پہنچ چکی ہیں تو جس نے (ان کو آنکھ کھول کر) دیکھا اس نے اپنا بھلا کیا اور جو اندھا بنا رہا اس نے اپنے حق میں برا کیا، اور میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں"۔ (سورۃ الانعام: ۱۰۳-۱۰۴)

To him is due the primal origin of the heavens and the earth.

بگ بینگ کی رُو سے ابتداء میں تمام اشیاء ایک وحدت کا حصہ تھیں جو بعد میں ٹکڑوں کی شکل میں بٹ گئیں۔ بگ بینگ کی اس حقیقت کو قرآن نے چودہ صدیاں پہلے اس وقت بیان کر دیا تھا جب انسان کا سائنسی علم نہایت محدود تھا۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ۔

کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا، اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں، پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ (سورۃ الانبیاء: ۳۰)

باب کے شروع میں بیان ہو چکا ہے کہ کائنات کا مسلسل پھیلاؤ اس امر کا سب سے مضبوط اور کافی ثبوت ہے کہ کائنات کو لاشے سے تخلیق کیا گیا۔ اگرچہ یہ امر تخلیق کائنات کے وقت سے اب تک اسی طرح ہے لیکن جدید سائنس نے اسے بیسویں صدی میں دریافت کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہم پر اس علم کا انعام چودہ سو سال پہلے کر چکا ہے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ٥

اور آسمانوں کو ہم ہی نے ہاتھوں سے بنایا اور ہم ہی اس کو وسعت دیتے جاتے ہیں۔ (الذّٰریٰت: ۴۷)

ایک منظم و منضبط دھماکہ جو باقاعدہ منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا

درحقیقت بگ بینگ نے مادیت اور دہریت کے لئے اس سے کہیں زیادہ مسائل کھڑے

کئے جن کا ذکر ہم اوپر دہریے فلسفہ دان انتونی فلیو کے بیان میں پڑھ چکے ہیں۔ بگ بینگ کی رُو سے کائنات نہ صرف لاشے سے وجود میں آئی بلکہ یہ عمل ایک منظم اور منضبط طور پر اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہوا۔

بگ بینگ یعنی دھماکے کے بعد ایک خاص ترتیب کا ظہور ہوا۔ دھماکے ابتری اور تباہی پیدا کرتے ہیں۔ نیوکلیائی اور ہائیڈروجن بم کے دھماکے، آتش فشاں کے دھماکے، قدرتی گیسوں اور تیل کے دھماکے، یہ سب تباہی اور انتشار پیدا کرتے ہیں۔

لیکن بگ بینگ کی صورت بالکل مختلف ہے۔ اس دھماکے کے بعد ایک ایسی تنظیم دیکھنے کو ملتی ہے جس کی جزوی تفصیلات باریک بینی سے طے کی گئیں تھیں۔ اس دھماکے سے مادے کے جو ٹکڑے ''بکھرے'' وہ ایک خاص ترتیب اور رفتار سے پھیلے اور پھر خاص محوروں میں گردش کرنے لگے۔ لگتا ہے یہ سب کچھ بے مہار نہیں تھا۔

سر فریڈ ہائل (Hoyle)، جس نے بگ بینگ کو برسوں کی مخالفت کے بعد حقیقت تسلیم کیا تھا، لکھتا ہے:

''بگ بینگ کی رُو سے کائنات کا آغاز ایک دھماکے سے ہوا۔ دھماکہ اشیاء کو بکھیرتا ہے لیکن بگ بینگ کا نتیجہ بڑے پراسرار طور پر عام مشاہدے سے متضاد ہے۔ اس نے مادے کو کہکشاؤں کے جھگھٹوں میں مجتمع کر دیا''۔

اس نے بگ بینگ کے ایک نظم وضبط میں منتج ہونے کو تضاد قرار دے کر فلسفہ مادیت کے حق میں تعصب کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس دھماکے کو ایک منضبط عمل (Controlled) ماننے پر تیار نہیں۔ لیکن تضاد دراصل خود اس کے اپنے بیان میں ہے۔ وہ تضاد کا شکار اس لئے ہوا کہ وہ ایک خالق یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود کو ماننے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس دھماکے سے ترتیب (Order) کا ظہور ہوا ہے تو اسے غیر منضبط دھماکہ (Uncontrolled Explosion) قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یعنی یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ دھماکہ ''غیر معمولی سخت نگرانی میں باقاعدہ منصوبہ بندی اور کسی خاص مقصدیت کے تحت ہوا تھا''۔

یہ ترتیبی مظہر بگ بینگ کے بعد بھی ہر منزل اور درجہ پر کارفرما نظر آتا ہے۔ دھماکے کے وقت مادہ جن ذرّات کی شکل میں خارج ہوا ہم آج انہیں ایٹمی ذرات (Atomic Particles) کہتے ہیں۔ لیکن یہ ذرّات بقول ہائل (Hoyle) پراسرار طور پر اکٹھے ہوئے اور ایٹم

بن گئے۔ اور کائنات ان سے بھر گئی۔ یہ ذرات کائنات کے مختلف حصوں میں مرتکز ہوئے اور کہکشاؤں کی شکل اختیار کر گئے۔ پھر ان کہکشاؤں میں ستارے بنے اور ستاروں کے گرد سیارے۔ کائنات کے طول و عرض میں سرگرداں یہ اجرام فلکی انتہائی منظم نظام کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں کہکشاؤں کی تعداد تین سو بلین ہے اور ہر کہکشاں تقریباً تین سو بلین ستاروں پر مشتمل ہے تو کائنات میں جاری و ساری غیر معمولی توازن اور ترتیب و تنظیم کا احساس ہوتا ہے۔

نازک توازن

بگ بینگ سے وجود میں آنے کے بعد کائناتی ترتیب کا ایک مزید حیرت انگیز پہلو اس کا قابل رہائش ہونا ہے۔ کسی سیارے پر زندگی موجود ہونے کے لئے جن حالات کا بیک وقت موجود ہونا ضروری ہے، اور جن شرائط کا بیک وقت پورا ہونا لازمی ہے تو وہ اتنی متنوع اور تعداد میں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا کسی حادثے کے تحت یا اتفاقاً پورا ہو جانا عقل و فہم سے بعید ہے۔ پال ڈیویز (Paul Davies) نظری طبیعات کا مشہور پروفیسر ہے وہ لکھتا ہے کہ زندگی کے لئے مناسب ماحول رکھنے والا سیارہ وجود میں آنے کے لئے ضروری ہے کہ کائنات ایک خاص رفتار سے پھیلے۔ پھیلنے کی اس شرح میں ایک بلین میں سے ایک حصے کا فرق بھی پڑ جائے تو ایسا سیارہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس نے جو رفتار ریاضیاتی فارمولے سے معلوم کی وہ تجربے سے معلوم کی گئی کائناتی پھیلاؤ کی رفتار کے برابر ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"محتاط پیمائشوں سے پتہ چلتا ہے کہ اگر پھیلاؤ کی رفتار اس کی موجودہ رفتار سے ذرا بھی زیادہ ہوتی تو کائنات خود اپنے تجاذب کے قابو میں نہ رہتی۔ اور اگر پھیلاؤ کی یہ رفتار اس خاص قیمت سے تھوڑی کم ہوتی تو کائنات اپنے تجاذب کے ہاتھوں تھوڑا سا پھیل کر دوبارہ سکڑتی اور دھماکے



ایٹا کارینے ستارہ سپرنووا دھماکے میں پھٹ رہا ہے۔ اس طرح کے دھماکے ہمیشہ بدنظمی لاتے ہیں لیکن سب سے بڑے دھماکے بگ بینگ نے انتہائی متوازن اور صحیح نظام پیدا کیا۔ اس طرح کے توازن کو کسی بھی طور محض اتفاق اور ہم زمانیت کی بنیاد پر بھی فرض نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً اسے قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔



ہم زمین پر اتنے چین سے رہتے ہیں کہ ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم ایک چھوٹے سے سیارے پر موجود ہیں جو بے کراں خلا میں ہزاروں کلو میٹر کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ لیکن خیال رکھا جانا چاہئے کہ زمین خالق کائنات نے انسان کے لئے خاص طور پر ایک محفوظ گوشے کے طور پر تخلیق کی۔

سے بھنچ کر رہ جاتی۔ ضرورت سے زیادہ اور ضرورت سے کم کی دو قیمتوں کے درمیان پھیلاؤ کی یہ معتدل اور مناسب رفتار کائنات کی زندگی کی ضامن ہے"۔

ایک اور سائنسی رسالے میں اس حیرت انگیز توازن کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے:

"اگر شروع میں، یعنی کہ بگ بینگ کے چند سیکنڈ بعد، مادے کی کثافت تھوڑی سی بھی زیادہ رہی ہوتی تو آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے مطابق ایٹموں کے باہمی تجاذب کی وجہ سے مادہ اپنا پھیلاؤ جاری نہ رکھ سکتا اور کائنات دوبارہ سکڑ کر اسی ایک نقطے کی شکل اختیار کر جاتی۔ اور اگر بگ بینگ کے وقت مادے کی کثافت ذرا کم ہوتی تو مادے کے پھیلنے کی رفتار اتنی زیادہ ہو جاتی کہ ایٹموں کی باہمی تجاذبی قوت انہیں باہم قریب کرنے میں کامیاب نہ ہو پاتی اور ستارے اور کہکشائیں کبھی وجود میں نہ آتے۔ اور ظاہر ہے کہ ہم بھی موجود نہ ہوتے۔ کائنات یہ خاص کثافت جو اسے فضائے بسیط میں گم ہو جانے یا دوبارہ واپس گر کر بھنچ جانے سے بچاتی ہے اسے فاصل کثافت (Critical Density) کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر بگ بینگ کے وقت مادے کی کثافت فاصل کثافت سے سو سو ٹریلین حصوں میں سے ایک حصہ بھی کم یا زیادہ ہوتی تو کائنات کبھی وجود میں نہ آتی۔ کائنات کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ یہ توازن اور بھی نازک ہوتا چلا گیا"۔

کائنات کے پھیلاؤ کی رفتار میں اس نازک توازن کے بارے میں مشہور طبیعات دان

سٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) اپنی کتاب ''وقت کی مختصر تاریخ'' (A BRIEF HISTORY OF TIME) میں یوں لکھتا ہے:

''اگر کائنات کا پھیلاؤ ایک فاصل رفتار سے کم یا زیادہ رہا ہوتا تو کائنات یا تو دوبارہ اپنے آپ میں گر کر ختم ہو چکی ہوتی یا پھر لاابدی طور پر پھیلتی ہی چلتی جاتی۔ اس کا پھیلاؤ اس خاص رفتار سے ہی کیوں ہوا؟ بگ بینگ کے دس ہزار ملین سال بعد آج بھی یہ تقریباً اسی فاصل رفتار سے کیوں پھیل رہی ہے۔ اگر بگ بینگ کے ایک سیکنڈ بعد اس کے پھیلنے کی رفتار اس فاصل رفتار سے ایک سو ہزار ملین ملین حصوں میں سے ایک حصہ بھی کم رہی ہوتی تو کائنات اپنے موجودہ حجم کو پہنچنے سے پہلے اپنے آپ میں گر کر ختم ہو گئی ہوتی''۔

اس دلچسپ صورت حال کے حوالے سے پال ڈیویز (Paul Davies) لکھتا ہے:

''کائنات کی شکل انتہائی باریک حساب کتاب میں ہونے والی اتنی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں پر منحصر ہے کہ ہم یہ تاثر لئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس کی موجودہ شکل کسی باقاعدہ منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ کائنات کے بنیادی مستقلوں (Fundamental Constants) کی عددی قیمتیں ایک دوسرے سے اتنی ہم آہنگ ہیں کہ ہم اسے کائناتی ڈیزائن کے موجود ہونے کی شہادت خیال کر سکتے ہیں''۔

اسی شہادت کے حوالے سے فلکیات کا امریکی پروفیسر جارج گرینسٹین (George Greenstein) اپنی کتاب ''ہم زیست کائنات'' (The Symbiotic Universe) میں لکھتا ہے:

''جیسے جیسے ہم اس شہادت کا جائزہ لیتے ہیں یہ خیال پیہم ابھرتا ہے کہ کوئی فوق الفطرت طاقت اس سارے عمل میں ملوث ہے''۔

یہ کوئی روایتی فلسفیانہ فکر نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا عقیدے سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنس آج اسے ثابت کر چکی ہے۔

انتباہ

جس باب کا اب آپ مطالعہ کرنے چلے ہیں، یہ آپ کی زندگی کے ایک بے حد نازک راز پر سے پردہ اٹھانے والا ہے۔

اسے بغور اور پورے انہماک سے پڑھیے کیونکہ یہ ایک ایسے موضوع سے متعلق ہے جو خارجی دنیا میں، آپ کے زاویہ نگاہ میں بنیادی تبدیلی لا سکتا ہے۔ اس باب کا موضوع محض ایک زاویہ نگاہ ہی نہیں ہے، نہ یہ ایک مختلف انداز نظر ہے نہ روایتی فلسفیانہ فکر: یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر انسان کو، اس پر یقین کرتے ہوئے یا نہ کرتے ہوئے، تسلیم کر لینا چاہئے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے آج سائنس بھی ثابت کر چکی ہے۔

حصّہ دوّم

مادے کی اصل روح

کوئی بھی باشعور شخص اپنے ضمیر کو سامنے رکھ کر گردو پیش پر غور کرے گا تو اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ کائنات میں ہر جاندار اور بے جان چیز پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ اُس کے سامنے یہ سوال ضرور آئے گا کہ یہ اشیاء کس نے پیدا کی ہیں۔ ''حقیقت تخلیق'' جو کائنات کے ہر پہلو سے عیاں ہے، از خود پیدا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ایک کھٹمل اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتا۔ نظام شمسی اپنے آپ کو پیدا کر کے اس ترتیب میں نہیں لا سکتا۔ یقیناً پودوں، انسانوں اور تتلیوں نے بھی خود کو پیدا نہیں کیا اور اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب اتفاقاً وجود میں آ گئے تھے۔

چنانچہ ہم مندرجہ ذیل نتیجے پر پہنچتے ہیں: ہر چیز جو ہم دیکھتے ہیں پیدا کی گئی ہے۔ لیکن ہمیں نظر آنے والی کوئی بھی چیز اپنی خالق نہیں ہو سکتی۔ اِن کا خالق ان سے علیحدہ اور برتر ہے۔ وہ ہر مرئی چیز سے برتر ہے۔ اگرچہ وہ ارفع اور برتر طاقت نظر نہیں آتی لیکن اس کا وجود مظاہر کائنات میں ہر کہیں عیاں ہے۔

یہی وہ نقطہ ہے جس پر وجودِ خداوندی کے ماننے والے بھی خود فریبی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ ایسے ذہنی اور فکری سانچے میں ڈھل چکے ہیں کہ جب تک وہ اُسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، اللہ تعالیٰ کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ لوگ تخلیق کے منکر نہیں لیکن وجودِ الٰہی اور اُس کے مقام کے حوالے سے توہماتی عقائد کا شکار ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ اوپر کہیں آسمانوں میں موجود ہے یا پھر وہ سمجھتے ہیں کہ وہ خالق کہیں دور ستاروں سے پرے بیٹھا ہے اور امورِ دنیا میں شاذ و نادر ہی مداخلت کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اُس نے کائنات بنائی اور پھر لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ خود اپنے مقدر کا تعین کریں۔

اور پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے سن رکھا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ہر جگہ موجود ہونا مذکور ہے لیکن وہ اس کا درست طور پر ادراک نہیں کر سکتے۔ وہ پس سوچتے چلے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شاید ریڈیو کی لہروں کی طرح یا کسی محسوس گیس کی صورت کائنات کو اپنے احاطے میں لیا ہوا ہے۔

خدا تعالیٰ کو ایک وجود دینے اور پھر اُسے کسی جگہ پر موجود پانے کا طرزِ فکر ایک ایسی غلطی ہے جو بہت سے لوگ کرتے ہیں اور اسی کے باعث وہ بعض اوقات وجودِ الٰہی سے انکار بھی کر بیٹھتے ہیں۔ دراصل انہوں نے بغیر کسی بنیاد کے ایک تعصب پال رکھا ہے یہ تعصب ہی خدا کے بارے میں غلط آراء کا ذمے دار ہے۔ یہ تعصب ہے کیا؟

دراصل یہ تعصب یا یکطرفہ اور بے بنیاد رائے مادے کی ماہیت کے خصائص کے حوالے سے ہے۔ ہم مادے کی موجودگی کے حوالے سے مفروضات کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ کبھی یہ سوال نہیں اُٹھاتے کہ آیا یہ واقعی موجود ہے یا محض ایک سایہ اور خیال ہے۔ جدید سائنس نے اس تعصب کا خاتمہ کر دیا ہے اور ایک نہایت اہم اور خود کو منوا لینے والی حقیقت دریافت کر لی ہے۔ اگلے صفحات میں ہم اس عظیم حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے جس کا اشارہ قرآن بھی دیتا ہے۔

برقی اشاروں کی دنیا

ہمیں اپنی رہائش گاہ، اس دنیا، کے متعلق تمام تر معلومات حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ دنیا انہی اشیاء پر مشتمل ہے جنہیں ہم دیکھ، سن، چھو، سونگھ اور چکھ سکتے ہیں۔ ہم اپنی پیدائش کے وقت سے لے کر بیرونی دنیا سے رابطے کے لئے ان پانچ حسوں پر انحصار کرتے چلے آئے ہیں ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ بیرونی دنیا میں کچھ ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کا ادراک ان پانچ کی مدد سے نہ ہو سکتا ہو۔

لیکن سائنس کی مختلف شاخوں میں ہونے والی جدید تحقیقات بالکل اور طرح کی تفہیم کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان تحقیقات نے ہمارے حواس اور ان کی مدد سے ادراک میں آنے والی دنیا کے بارے میں بڑے سنجیدہ اور خطرناک شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے۔

اس جدید طرزِ فکر کے آغاز کے طور پر ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس خارجی دنیا کی جو تصویر

ہمارے ذہن میں بنتی ہے وہ صرف ہمارے دماغ کا خارج سے آنے والے برقی اشاروں (ELECTRICAL SIGNALS) پر ردِ عمل ہے۔ سیب کی سرخی، لکڑی کی تختی، اپنے ماں باپ اور خاندان، گھر، نوکری، اور اس کتاب کی سطر سب کچھ اُن برقی اشاروں سے مرتب ہو کر بنا ہے۔

فریڈرک ویسٹر (FREDERICK VESTER) سائنس کے اس نتیجہ پر بات کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''کچھ سائنس دانوں کا یہ بیان کہ ''انسان صرف تخیل ہے، ہر مشاہدہ اور واردات عارضی اور فریب ہے اور یہ کائنات محض ایک ہیولہ ہے'' موجودہ سائنس کی روشنی میں ایک ثابت شدہ حقیقت نظر آتا ہے''۔

مشہور فلسفہ دان جارج برکلے (George Berkeley) اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتا ہے:

''ہم اشیاء کے ہونے پر محض اس لئے یقین کرتے ہیں کہ ہم انہیں دیکھ اور چھو سکتے ہیں اور ہمارا ادراک ہمیں اُن پر منعکس کرتا ہے۔ تاہم ہمارے ادراک صرف ہمارے ذہنی خاکے ہیں اس لئے جن اجسام کا ہم ادراک کرتے ہیں وہ سوائے خاکوں اور خیالوں کے کچھ نہیں اور سوائے ہمارے ذہن کے وہ کہیں نہیں پائے جاتے۔ چنانچہ جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کائنات اور اشیاء ہمارے ذہن سے باہر بھی موجود ہیں تو دراصل ہم اپنے ادراک کے ہاتھوں دھوکہ کھا رہے ہوتے ہیں اس لئے ہمارے اردگرد کی اشیاء کا ہمارے دماغ سے باہر کوئی وجود نہیں''۔

اس موضوع کی مزید وضاحت کے لئے ہمیں اپنی حس بصارت پر غور کرنا ہوگا کیونکہ یہ ہمیں خارجی دنیا پر سب سے زیادہ معلومات فراہم کرتی ہے۔

ہم کیسے دیکھتے، سنتے اور چکھتے ہیں؟

دیکھنے کے عمل پر ہمارا علم کافی ترقی کر چکا ہے۔ کسی وجود سے آنے والے روشنی کے فوٹون (Photon) ہماری آنکھ کے عدسے سے گزر کر اس کے پیچھے ایک پردے ریٹینا (Retina) پر اُلٹے انداز میں پڑتے ہیں۔ اس روشنی کو برقی اشاروں میں تبدیل کر کے دماغ کے پچھلے حصے میں موجود ایک چھوٹے سے نقطے کو ارسال کر دیا جاتا ہے اس نقطے کو مرکز بینائی کہتے ہیں۔ مرکز بینائی میں اس برقی اشارے کا کئی مراحل سے گزرنے کے بعد ایک عکس کی صورت ادراک ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھنے کا عمل دماغ کے پچھلے حصے میں واقع ایک چھوٹے سے نقطے میں وقوع پذیر ہوتا ہے جو

بجائے خود روشنی سے مکمل طور پر منقطع رکھا گیا ہے۔

آیئے اب ہم اس بظاہر عام سے طرز کار پر غور کرتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں تو جس چیز کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ دراصل برقی پردہ کے اثرات ہیں جنہیں ہماری آنکھوں نے دماغ کو ارسال کیا ہے۔ چنانچہ جب ہم دیکھتے ہیں تو دراصل ہم اپنے دماغ میں برقی اشاروں کا مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں۔

ہم زندگی میں جتنے بھی عکس دیکھتے ہیں سب مرکز بینائی میں بنتے ہیں جو ہمارے دماغ میں صرف چند مکعب سینٹی میٹر کی جگہ گھیرتا ہے۔ چاہے یہ کتاب ہو، یا آسمان کا بے کراں نظارہ، سب کچھ اس چھوٹے سے محدود علاقے میں وقوع پذیر ہو رہا ہوتا ہے۔ ایک اور بات جس کا خیال رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ دماغ مکمل تاریکی میں ہے۔ اس کا روشنی سے کوئی تعلق نہیں۔



کسی بیرونی جسم سے آنے والے اشارات ہماری آنکھوں میں برقی اشاروں میں تبدیل ہوتے ہیں اور ہمارا دماغ ان سے اس چیز کا ادراک کرتا ہے۔

ہم اس دلچسپ صورت حال کی وضاحت ایک مثال سے کر سکتے ہیں۔ فرض کریں کہ ہمارے سامنے ایک شمع جل رہی ہے جب ہم اسے دیکھتے ہیں تو ہمارے دماغی اعصاب کا اس کی روشنی کے ساتھ براہ راست ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس دوران بھی دماغ کا مادہ ایک ٹھوس اور مکمل تاریکی میں ہوتا ہے۔ ہم روشن اور رنگا رنگ دنیا کا مشاہدہ اپنے تاریک دماغ کے اندر کرتے ہیں۔

بصارت کا عمل ہمارے نزدیک کبھی قابل غور نہیں رہا۔ آر۔ ایل۔ گریگری (R.L.

(Gregory بصارت کے معجزانہ پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

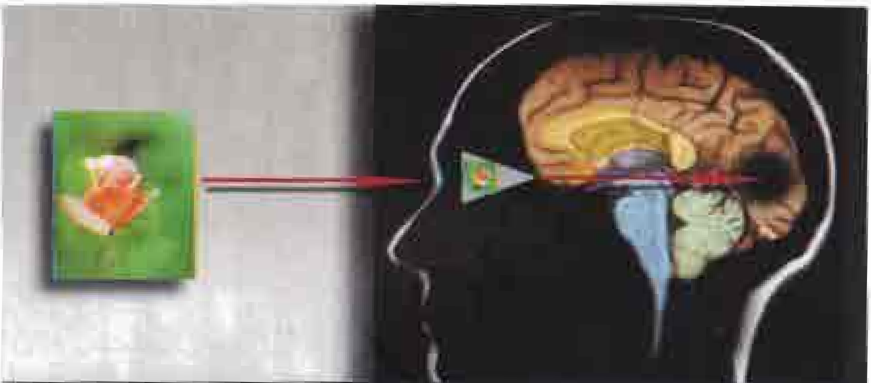
"ہم عمل بصارت سے اتنے آشنا ہیں کہ اس کی باریکیوں پر غور کرنے کے لیے تخیل کی جست لازمی ہے۔ غور کیجئے۔ ہماری آنکھ میں ایک چھوٹا سا، مسخ شدہ اور الٹا عکس بنتا ہے۔ لیکن ہم اپنے گردوپیش میں ٹھوس اجسام جدا جدا دیکھتے ہیں۔ ہماری آنکھ کا پردہ باہر سے آنے والی روشنی کو مختلف نمونوں کے برقی اشاروں میں منتقل کر دیتا ہے اور یوں ہم دنیائے اجسام کا ادراک کرتے ہیں۔ یہ عمل معجزے سے کسی طرح بھی کم نہیں"۔

یہی صورت حال دوسری حسیات کی بھی ہے۔ آواز، لمس، ذائقہ اور بو، سب برقی اشاروں کی صورت دماغ کو ارسال کیے جاتے ہیں جہاں متعلقہ مراکز میں ان کا ادراک ہوتا ہے۔

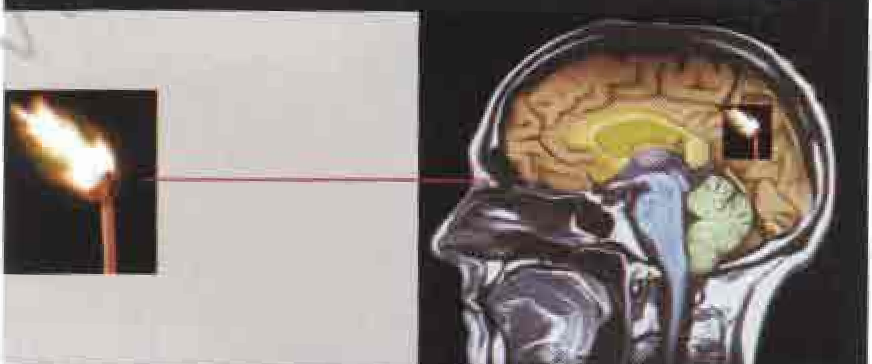
حس سماعت بھی اسی طریقے پر کام کرتی ہے۔ کان کا بیرونی حصہ موجود آوازوں کو پکڑ کر وسطی کان تک پہنچاتا ہے۔ یہ حصہ آواز کے ارتعاش کی طاقت کو بڑھا کر اسے اندرونی کان کو ارسال کر دیتا ہے۔ اندرونی کان ان لہروں کو برقی اشاروں میں تبدیل کرتا ہے اور انہیں دماغ کو بھیج دیتا ہے۔ سننے کا آخری عمل دماغ میں موجود مرکز سماعت میں ہوتا ہے۔ مرکز بصارت کی طرح مرکز سماعت بھی بیرونی دنیا سے مکمل کٹا ہوا ہوتا ہے۔ باہر کتنا بھی شور کیوں نہ ہو دماغ کے اندر مکمل خاموشی ہوتی ہے۔

بلاشبہ دماغ خفیف ترین آوازیں بھی سن لیتا ہے۔ ادراک کی صحت کا یہ عالم ہے کہ ایک صحت مند شخص کا کان ہر قسم کے بیرونی شور کے باوجود مکمل صفائی سے اور درست طور پر سنتا ہے آپ کا دماغ گردوپیش سے مکمل طور پر غیر منسلک ہے لیکن آپ پتوں کی سرسراہٹ سے لے کر جیٹ JET جہاز کی گرج تک سن سکتے ہیں۔ ہمارے کان بہت کم سے لے کر بہت بلند فریکوئنسی کی آوازیں سننے اور شناخت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر ہم کسی حساس آلے کی مدد سے اپنے دماغ کے اندر شور کی کیفیت کا جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ وہاں مکمل خاموشی کا راج ہے۔

ہم بو کا ادراک بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ وینیلا یا گلاب سے نکلنے والے خوشبو کے مالیکیول ہماری ناک میں ایپیتھیلیم (Epithelium) حصے میں پہنچ کر وہاں موجود نازک بالوں کے ساتھ کیمیائی تعامل میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ اس تعامل سے پیدا ہونے والے برقی اشارے دماغ کو بھیجے جاتے ہیں جہاں ایک مخصوص حصے میں یہ اشارے خوشبو کا ادراک پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ خوشبو ناخوشگوار ہو یا خوشگوار در اصل صرف اُن برقی اشاروں کا ادراک ہے جو خوشبو کے



باہر سے آنے والی روشنی ہمارے ریٹینا پر عکس معکوس بناتی ہے یہاں عکس برقی اشاروں میں بدل جاتا ہے جنہیں دماغ کے پچھلے حصے میں واقع مرکز بینائی تک بھیج دیا جاتا ہے۔ دماغ کے اس حصے تک روشنی کی براہ راست رسائی ممکن نہیں۔ چنانچہ ہم رنگ و نور کی ایک وسیع دنیا کو ایک تاریک اور چھوٹے سے حصے میں دیکھتے ہیں۔



جب ہم روشنی دیکھتے یا حرارت محسوس کرتے ہیں، ہمارا دماغ اندر سے تاریک ہی رہتا ہے اور اس کے درجہ حرارت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مالیکیولوں اور ہمارے ناک میں موجود مادے کے باہمی تعامل سے پیدا ہوتا ہے۔ خوشبو کے مالیکیول دماغ میں ہرگز نہیں پہنچتے بصارت کی طرح ہمارے دماغ میں صرف برقی اشارے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن خوشبوؤں کو آپ بیرونی دنیا سے متعلق خیال کرتے رہے ہیں وہ صرف برقی اشارے ہیں۔

انسانی زبان کے اگلے حصے میں چار مختلف طرح کے کیمیائی وصولندہ (Chemical Receptors) پائے جاتے ہیں۔ یہ نمکین، میٹھا، ترش اور تلخ ذائقہ محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب منہ میں ڈالی گئی کوئی چیز ان سے چھوتی ہے تو کیمیائی تعاملات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک برقی اشارہ خارج ہوتا ہے جو دماغ کو بھیج دیا جاتا ہے چنانچہ سیب یا لیموں کا ذائقہ جو آپ کو اس قدر پسند ہے صرف دماغ کو بھیجے گئے برقی اشاروں کی تاویل ہے۔ دماغ سے باہر ذائقہ نامی کوئی چیز نہیں۔ ایسی کوئی چیز موجود نہیں جسے دیکھ، چھو یا سن کر آپ کہہ سکیں کہ یہ ترشی، تلخی یا مٹھاس ہے۔ اگر زبان سے دماغ کو ذائقے کے برقی اشارے لے جانے والے اعصاب کٹ جائیں تو ہر قسم کے ذائقے کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں ہمارا سامنا ایک اور حقیقت سے ہوتا ہے ہم کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ایک خوراک کا جیسا ذائقہ ہمیں محسوس ہوا ویسا ہی کسی دوسرے شخص کو محسوس ہوگا یا نہیں۔ یا کسی آواز کا جس طرح کا ادراک ہم نے کیا کوئی دوسرا بھی اس کا ایسا ادراک کر سکے گا یا نہیں۔ اس حقیقت پر تبصرہ کرتے ہوئے لنکن بارنے (Lincoln Barnett) کہتا ہے کہ ہمیں کبھی پتہ نہیں چل سکتا کہ سرخ رنگ یا موسیقی کے کسی خاص سر کا ہمارا ادراک کسی اور شخص کے ادراک سے ملتا جلتا ہے یا مختلف۔

ہمارے چھونے کی حس بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ جب ہم کسی جسم کو چھوتے ہیں تو ہماری جلد کے اعصاب شناخت کے لئے تمام ضروری معلومات برقی اشاروں کی صورت دماغ کو بھیج دیتے ہیں۔ چھونے کا احساس ہمارے دماغ میں تشکیل پاتا ہے۔ عام طور پر پایا جانے والا یہ خیال غلط ہے کہ چھونے کی حس ہماری انگلیوں کے سرے یا جلد میں ہے۔ اس کا مرکز دراصل ہمارے دماغ میں ہے۔ کسی چیز کے سخت، نرم، گرم یا ٹھنڈا ہونے کا احساس ہمارے دماغ میں ان برقی اشاروں کے تجزیے کے بعد پیدا ہوتا ہے جو جلد سے دماغ کو بھیجے جاتے ہیں۔ اس اہم حقیقت پر دو مشہور فلسفہ دانوں برٹرینڈ رسل اور وٹ گینسٹین (Witt Geinstein) نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

"مثال کے طور پر ایک لیموں کے حقیقتاً موجود ہوتے یا نہ ہونے یا ان کے وجود میں آنے پر سوال اور تحقیق نہیں کی جا سکتی۔ ایک لیموں محض زبان سے چکھے جانے والے ذائقے، ناک سے سونگھی جانے والی بو اور آنکھ سے دیکھی جانے والی شکل اور رنگ پر مشتمل ہے۔ صرف یہی وہ صفات ہیں جن کا جائزہ لے کر انہیں جانچا جا سکتا ہے۔ سائنس طبعی دنیا کو کبھی نہیں جان سکتی"۔

طبعی دنیا تک رسائی ہمارے لیے ناممکن ہے ہمارے اردگرد کے تمام اجسام محض بصری، سمعی، اور لمسی ادراکات کے مجموعے ہیں۔ ہم اپنے دماغ کے بصری اور دوسرے مراکز میں ہونے والے تجزیے کے ذریعے جو کچھ دیکھتے ہیں وہ بیرونی دنیا میں موجود اصل مادہ نہیں بلکہ ہمارے دماغ میں بننے والی نقل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم غلطی کرتے ہیں۔ ہم یہ غلط مفروضہ طے کر لیتے ہیں کہ دماغ میں بننے والی یہ نقول ہمارے اردگرد موجود اصل مادے کی امثال ہیں۔

ہمارے دماغ میں موجود ''خارجی دنیا''

اب تک بیان شدہ طبعی حقائق کے نتیجے میں ہم مندرجہ ذیل نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ہم اپنی بصارت، لامسہ اور سامعہ سے ادراک میں آنے والی جس چیز کو مادہ دنیا یا کائنات کہتے ہیں وہ سوائے ہمارے دماغ میں موجود برقی اشاروں کے اور کچھ نہیں۔

کسی پھل کھاتے ہوئے شخص کا واسطہ اصل پھل سے نہیں پڑتا بلکہ وہ صرف اپنے دماغ کے ادراک سے واقف ہے۔ جس شے کو وہ شخص پھل سمجھ رہا ہے وہ دراصل دماغ میں شکل، ذائقہ، خوشبو اور لمس سے متعلق ادراکات کا مجموعہ ہے۔ اگر ناک سے دماغ کو جانے والے اعصاب کاٹ دیئے جائیں تو پھل کی خوشبو فوراً غائب ہو جائے گی۔ بالکل اسی طرح اگر بصری







ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے دراصل ہمارے دماغ کے اندر موجود مرکز بینائی پر ہونے والا ادراک ہے۔ دماغ کا یہ حصہ بمشکل چند مکعب سینٹی میٹر حجم کا ہے۔ چاہے آپ کوئی قدرتی منظر دیکھیں یا یہ کتاب پڑھیں، منظر اسی محدود سے حصے میں سماجاتا ہے چنانچہ ہمیں اشیا جتنی ہیں اتنی نہیں بلکہ اتنی نظر آتی ہیں جس قدر ہمارا دماغ ان کا ادراک کرتا ہے۔

اعصاب کاٹ دیئے جائیں تو سیب کی شبیہ دماغ سے غائب ہو جائے گی۔ سادہ الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ پھل صرف دماغ میں ہونے والی برقی اشاروں کی تشریح اور تعبیر ہے۔ سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔

ایک اور قابل غور نقطہ فاصلے کا احساس ہے۔ فاصلہ دماغ میں محسوس ہونے والے خالی پن کا احساس ہے۔ ہمیں جو چیزیں دور نظر آتی ہیں وہ بھی ہمارے دماغ میں موجود ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص آسمان میں ستارے دیکھتا ہے تو وہ فرض کر لیتا ہے کہ یہ اس سے کئی ملین نوری سال کے فاصلے پر ہیں اس کے باوجود وہ جو کچھ دیکھتا ہے وہ اُس کے اندر موجود ستارے ہیں۔ یعنی کہ وہ سب ستارے اس کے مرکز بصارت میں ہیں۔ جس کمرے میں بیٹھے آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہیں درحقیقت آپ اُس کے اندر نہیں ہیں بلکہ وہ کمرہ آپ کے اندر ہے۔ آپ کو اپنے جسم کو دیکھنے کی صلاحیت آپ کو یہ سمجھنے پر مجبور کرتی ہے کہ آپ کمرے کے اندر ہیں۔ آپ کو یہ بات لازماً یاد رکھنی چاہئے کہ آپ کا جسم بھی دراصل دماغ میں بننے والی ایک شبیہ ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ہماری دوسری حسوں پر بھی اس اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً جب آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ساتھ کے کمرے سے ٹیلی ویژن کی آواز سنائی دے رہی ہے تو دراصل، آپ اپنے دماغ کے اندر آواز سن رہے ہیں۔ آپ نہ تو یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ اگلا کمرہ موجود ہے اور نہ ہی یہ کہ آواز اس کمرے میں موجود ٹیلی ویژن سے آ رہی ہے۔ دراصل خارج سے آنے والی ہر آواز کا ادراک ہمارے دماغ میں موجود چند مربع سینٹی میٹر جسامت کے مرکز سماعت میں ہوتا ہے۔ اگر اس مرکز ادراک کو منقطع کر دیا جائے تو پھر دائیں



گلاب کا پھول ایک صحت مند شخص کو سرخ نظر آتا ہے
جبکہ یہی پھول کلر بلائنڈ شخص کو سرخ نہیں لگے گا۔

بائیں یا پیچھے آگے کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا یعنی کہ آواز آپ کو دائیں، بائیں یا ہوا میں سے نہیں آتی۔ دراصل آواز کی کوئی سمت نہیں۔

یہی حال قوتِ شامہ کا بھی ہے۔ کوئی خوشبو بھی کہیں دور سے نہیں آتی آپ صرف اپنے تجربے سے فرض کر لیتے ہیں کہ یہ جو ایک خاص طرح کا احساس میرے دماغ میں پیدا ہوا ہے یہ فلاں چیز کی خوشبو ہے۔ جس طرح پھول کی شبیہ صرف آپ کے مرکزِ بصارت میں موجود ہے اسی طرح اس کی خوشبو بھی صرف آپ کے دماغ کے مرکزِ شامہ میں موجود ہے۔ خارجہ میں گلاب موجود ہے اور نہ ہی اس سے وابستہ خوشبو۔

چنانچہ ہمارے ادراک ہمارے سامنے جس خارجی دنیا کو پیش کرتے ہیں محض برقی اشاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ ہم اپنی ساری زندگی ان اشاروں کا تجزیہ کرتے ہیں اور اس حقیقت کا ادراک نہیں کر پاتے کہ یہ خارجی دنیا میں موجود مادے کا اصل روپ نہیں۔ ہماری اس کمزوری کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حواس کی مدد سے مادے کی اصل تک رسائی نہیں پا سکتے۔

مزید برآں بیرونی دنیا سے آنے والے اشاروں کی تعبیر اور ان سے معانی وابستہ کرنے کی ذمہ داری بھی ہمارے دماغ پر ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے ایک مثال پر غور کرنا ضروری ہے۔ بیرونی دنیا سے آنے والی آواز کی دنیا کو ہمارا دماغ موسیقی کی شکل دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موسیقی بھی ہمارے دماغ کا پیدا کردہ ایک ادراک ہے۔ خارجی دنیا میں کسی طرح کے رنگ موجود نہیں۔ نہ آسمان نیلا ہے نہ ہی گلاب سرخ۔ یہ اس طرح کے اس لئے ہیں کہ ہمیں ان کا اس طرح ادراک ہوتا ہے۔ خارجی دنیا کا انحصار مکمل طور پر ادراک کرنے والے پر ہے۔

آنکھ کے پردے میں پیدا ہونے والا معمولی سا نقص بھی رنگوں کا اندھا پن پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کو سرخ رنگ نیلا اور نیلا رنگ سبز نظر آتا ہے۔ آنکھوں کے نقائص کی ایک اور قسم میں ہر رنگ کے ساتھ بھورے رنگ کی کم یا زیادہ جھلک ملی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس خرابی میں خارجی جسم بے رنگ بھی ہو تو رنگ دار نظر آتا ہے۔

ممتاز مفکر برکلے (Berkeley) اس موضوع پر یوں اظہارِ خیال کرتا ہے:

"شروع میں خیال کیا جاتا تھا کہ رنگ اور بو وغیرہ حقیقتاً موجود ہوتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس خیال کو مسترد کر دیا گیا۔ آج ہم جانتے ہیں کہ ان کا وجود ہمارے ادراک پر منحصر ہے"۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اشیاء ہمیں اس لئے رنگین نظر نہیں آتیں کہ وہ رنگ دار ہیں بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم خارجی دنیا کے ساتھ جو خصوصیات بھی وابستہ کرتے ہیں وہ دراصل ہمارے اندر موجود ہیں۔

تو پھر "خارجی دنیا" میں کیا بچتا ہے۔

کیا "خارجی دنیا" کا وجود ناگزیر ہے؟

ابھی تک ہم نے خارجی دنیا اور اپنے دماغ میں اس کے ادراک کی بات کی ہے۔ ان میں سے جسے ہم دیکھتے ہیں وہ ادراک ہے۔ چونکہ ہم خارجی دنیا تک اصلاً رسائی نہیں رکھتے اس لئے یہ فیصلہ کیسے ہوگا کہ ایسی کوئی دنیا موجود بھی ہے یا نہیں۔ دراصل ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ چونکہ ہر جسم صرف ادراکات کا مجموعہ ہے اور ادراکات صرف دماغ میں موجود ہیں اس لئے یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ادراکات کی دنیا ہی اصلاً موجود ہے۔ ہم جس دنیا کے بارے میں کچھ جان سکتے ہیں وہ دماغ میں موجود دنیا ہی ہے۔ یعنی کہ ہم اسی دنیا کے گرد کچھ جان سکتے ہیں جو ہمارے دماغ میں بن کر محفوظ ہوگئی ہے۔ بالفاظ دیگر ہم صرف دماغ میں تخلیق کی گئی دنیا کے بارے میں کچھ جان سکتے ہیں۔

ہم کبھی یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ہمارے ذہنی ادراکات کے مادی مناسبات لازمی طور پر موجود ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ادراکات کسی "مصنوعی" منبع سے آنے والی اطلاعات کا نتیجہ ہوں۔

اس حقیقت کا مشاہدہ ممکن ہے۔ دماغ کو جعلی مہیجات (Stimulation) کی فراہمی سے ایک تخیلی "مادی دنیا" بنائی جا سکتی ہے۔ فرض کریں کہ ہمارے پاس ریکارڈ کرنے کا ایسا نظام موجود ہے جس میں ہر قسم کے برقی اشارے ریکارڈ کیے جا سکتے ہیں۔ ہم کسی شے کی جسمانی ہیئت سمیت تمام دوسرے مہیجات کو برقی اشاروں کی شکل میں ریکارڈ کر لیتے ہیں۔ اب فرض کریں کہ آپ کے پاس ایک دماغ موجود ہے جو جسم سے باہر زندہ رہ سکتا ہے۔ اب آپ اپنی ریکارڈنگ اعصاب کے ذریعے دماغ کو بھیجتے ہیں۔ اب، اگر یہ دماغ آپ کا ہے تو، آپ ایک مصنوعی بنائی ہوئی دنیا کا مشاہدہ کریں گے۔ آپ کو بآسانی باور کروایا جا سکتا ہے کہ آپ کسی ہائی وے پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دماغ کو ادراک کے لئے بیرونی دنیا کی نہیں مناسب مہیجات (Stimulants) کی ضرورت ہے جو ہم برقی اشاروں کی صورت میں فراہم کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ مہیجات برقی اشاروں کی صورت کسی اور منبع سے آرہے ہوں۔

مصنوعی Stimulation کے ذریعے ہمارے دماغ میں حقیقی دنیا کی سی ایک دنیا آباد کی جاسکتی ہے۔
اس کے نتیجے میں روزمرہ کے ہر مشاہدہ اور تجربے کو دماغ میں مصنوعی طور پر پیدا کیا جاسکتا ہے۔



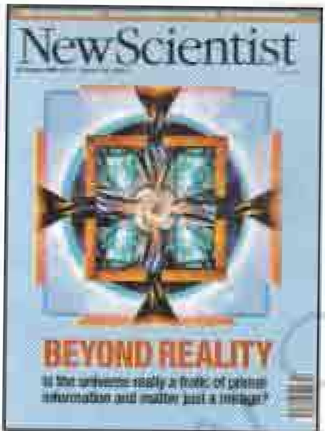
اس مسئلے پر سائنسی فلسفہ دان برٹرینڈ رسل اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:
"جب ہم کسی ٹھوس چیز مثلاً ایک میز کو چھوتے ہیں تو جو لمس ہمیں محسوس ہوتا ہے دراصل ہماری انگلیوں کے الیکٹرانوں اور پروٹونوں میں ہونے والی مداخلت ہے جو، جدید طبیعات کے مطابق، میز کے الیکٹرانوں اور پروٹونوں کے قرب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر ایسی ہی مداخلت کسی اور وجہ سے ہو تو ہم یہی خیال کریں گے کہ ہماری انگلیاں میز کو چھو رہی ہیں"۔

ہمارے لئے بغیر کسی مادی مناسبت کے پیدا ہو جانے والے ہیجات سے جنم لینے والے برقی اشاروں کے ہاتھوں دھوکہ کھا جانا کچھ اتنا بعید از قیاس نہیں۔ ہم خوابوں میں اس کیفیت سے اکثر گزرتے ہیں۔ خوابوں میں ہم افراد سے ملتے اور مختلف جگہوں پر جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمیں حقیقی معلوم ہوتا ہے حالانکہ یہ سب ادراک کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ خواب اور حقیقت میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ دونوں دماغ میں واقع ہوتے ہیں۔

ادراک کیسے ہوتا ہے؟

ہمارے اب تک کے بیان کردہ حقائق کی روشنی میں اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہ جانا چاہیے کہ جہاں ہم رہ رہے ہیں اور جسے ہم خارجی دنیا کہتے ہیں دراصل ہمارے دماغ میں پیدا کی جاتی

ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو زیادہ بنیادی نوعیت کا ہے۔ اگر ہمارے تمام واقعات اور اشیاء اپنی ماہیت میں صرف دماغ میں پیدا ہونے والے ادراک ہیں تو پھر دماغ کیا ہے۔ چونکہ دماغ بھی آنکھ، کان اور ناک کی طرح مادی دنیا کا ایک حصہ ہے چنانچہ اسے بھی دوسرے وجودوں کی طرح ایک ادراک خیال کیا جانا چاہئے۔



جدید طبیعات بتاتی ہے کہ کائنات ادراکات کے مجموعے کا نام ہے۔ درج ذیل سوال معروف امریکی سائنسی جریدے "نیا سائنس دان" کی ۳۰ جنوری ۱۹۹۹ء کی اشاعت میں اٹھایا گیا ہے۔
"حقیقت سے آگے۔ کیا کائنات واقعی ابتدائی معلومات کا ایک کھیل اور مادہ فقط ایک سراب ہے؟"

خوابوں کے متعلق ایک مثال سے حقیقت حال واضح ہو جاتی ہے۔ فرض کریں کہ ہم خواب میں ایک شخص کو دیکھتے ہیں۔ اس کے اعضائے جسمانی سمیت ہر چیز تخیلی ہوگی۔ اگر کوئی ہم سے ہمارے خواب کے متعلق پوچھے کہ یہ سب آپ نے کہاں دیکھا تو آپ کا جواب ہوگا "اپنے دماغ میں"۔ لیکن ایسی کسی چیز کا وجود نہیں جسے دماغ کہا جائے اور اس کے متعلق بات کی جائے کیونکہ سر اور دماغ دونوں تخیلی ہیں۔ چنانچہ تخیل دیکھنے کا کام دماغ نہیں کرتا جو خود ایک تخیل ہے بلکہ کوئی اور ہستی کرتی ہے جو اس سے بہت برتر ہے۔

اب ہم جانتے ہیں کہ خواب اور اس دنیا میں جسے ہم حقیقی کہتے ہیں کوئی فرق نہیں۔ اب ہم سے کوئی خارجی دنیا کے کسی مشاہدے پر سوال کرے کہ آپ نے یہ کہاں دیکھا تو اس کا یہ جواب کہ "اپنے دماغ میں دیکھا" خاصا بے معنی نظر آئے گا۔ لیکن یہ جواب بھی خواب والی مثال کے جواب کی طرح اور اتنا ہی بے معنی ہے۔ ان دونوں مثالوں میں جو دیکھتا ہے دراصل دماغ نہیں بلکہ اس سے برتر کوئی ہستی ہے۔

جب دماغ کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ سوائے پروٹین (Protein) اور لپڈ (Lipid) کے اور کچھ نہیں۔ یہی مالیکیول دوسرے جانداروں میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گوشت کے اس لوتھڑے میں جسے ہم اپنا دماغ کہتے ہیں ایسی کوئی چیز موجود نہیں کہ شبیہ کا مشاہدہ، شعور کی تشکیل یا "آپ کی ذات" جیسی چیز پیدا کر سکے۔

لوگ دماغ میں شبیہ کے ادراک کے سلسلے میں جو فکری غلطی کرتے ہیں اس پر جارج گریگوری یوں اظہار خیال کرتا ہے:

''یہ کہنے کا رجحان عام ہے کہ دماغ میں تصویر آنکھ پیدا کرتی ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ دماغ میں موجود تصویر اپنے دیکھے جانے کے لئے کسی اندرونی آنکھ کی متقاضی ہے۔ اس اندرونی آنکھ میں موجود تصویر کو دیکھنے کے لئے ایک اور آنکھ کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ آنکھوں اور تصویروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا جو لایعنی ہے''۔

یہی وہ نقطہ ہے جو مادیت پرستوں کو، جو سوائے مادے کے کسی اور حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، مشکل سے دوچار کر دیتا ہے۔ ''اندر کی یہ آنکھ'' جو دیکھتی اور ادراک کرتی ہے کس کی ہے۔ دنیائے سائنس و فلسفہ میں اس سوال پر کارل پریبریم (Karl Pribram) نے غور کیا کہ وہ ادراک کرنے والی طاقت یا مدرک کون ہے۔

''یونانیوں کے وقت سے لے کر ''مشینمیں بھوت'' یا ''چھوٹے آدمی میں ایک اور چھوٹا آدمی'' جیسی تمثیلات استعمال ہو رہی ہیں۔ ''میں'' یعنی وہ ذات کہاں ہے جو اس کا دماغ استعمال کرتا ہے۔ کون ہے جو اس جاننے کے عمل کا اثبات کرتا ہے؟ اسیسی کے سینٹ فرانسس (Saint Francis of Assisi) کے الفاظ میں ''ہمیں اس کی تلاش ہے جو دیکھتا ہے''۔

اب اس پر غور کریں۔ آپ کے ہاتھ میں موجود کتاب اور کمرے کی ہر چیز دراصل آپ کے دماغ میں ہے۔ کیا ان کی شبیہیں ایٹم دیکھتے ہیں؟ بے بصر، بہرے اور بے شعور ایٹم؟ آخر کچھ ایٹم ہی یہ خاصیت کیوں حاصل کر پاتے ہیں جبکہ دوسرے نہیں۔ کیا ہماری فکر، فہم، یادداشت، خوشی، غمی اور باقی بہت سی دوسری چیزیں محض ان ایٹموں کے برقی کیمیائی تعاملات ہیں۔

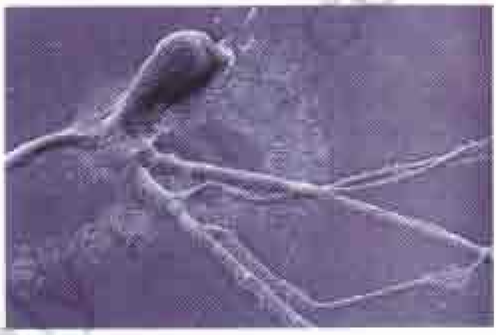
ان سوالوں پر غور کرتے ہوئے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایٹموں میں ارادہ کی تلاش دانشمندی نہیں۔ چنانچہ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے والی ہستی مادے سے ماوراء ہے۔ یہی ہستی ''زندہ'' ہے لیکن یہ مادہ ہے اور نہ ہی مادے کی شبیہہ۔ یہ ہستی ہمارے جسم کی شبیہہ استعمال کر کے اپنے سامنے موجود شبیہہ سے تعلق پیدا کرتی ہے۔

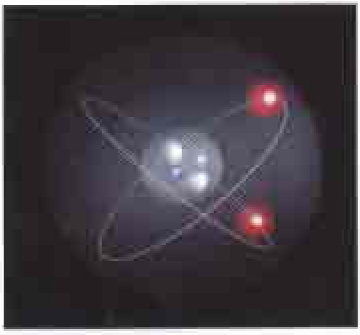
یہ وجود ہماری ''روح'' ہے۔

ادراکات کے جس مجموعے کو ہم ''مادی دنیا'' کہتے ہیں دراصل اس روح کا خواب ہے۔ جس طرح ہمارے جسم اور زیر مشاہدہ خارجی دنیا کی کوئی اصلیت نہیں اسی طرح ہماری کائنات کی بھی کوئی مادی حیثیت نہیں۔

حقیقی وجود صرف روح کا ہے۔ مادہ صرف روح کے ادراکات کے مجموعے کا نام ہے۔

چنانچہ وہ ذہین مخلوق جولکھتی اور یہ لائنیں پڑھتی ہے ایٹموں اور ان کے درمیان کیمیائی تعاملات کا مجموعہ نہیں بلکہ روح ہے۔





دماغ لحمیات اور چکنائی کے مالیکیولوں سے بنا گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ یہ ایسے خلیات سے مرکب ہے جنہیں Neuron یا اعصاب کہتے ہیں۔ اس لوتھڑے میں تماثیل کے مشاہدے کی صلاحیت موجود نہیں۔ نہ ہی یہ شعور یا اثبات ذات کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اصل وجود مطلق

ان حقائق کی وجہ سے ہمیں ایک نہایت اہم سوال کا سامنا ہے۔ جس چیز کا مادی دنیا ہونا ہم تسلیم کرتے ہیں اگر یہ محض ادراکات پر مشتمل ہے جسے ہماری روح دیکھتی ہے تو پھر ان ادراکات کا منبع کونسا ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ہمیں مندرجہ ذیل حقیقت کو سامنے رکھنا ہوگا:

مادے کے پاس اپنے آپ پر حکومت کرنے والا کوئی وجود نہیں۔ اور چونکہ مادہ صرف ایک ادراک ہے اس لئے یہ جو کچھ بھی ہے مصنوعی ہے۔ یعنی درحقیقت یہ پیدا کیا گیا ہے۔ مزید برآں اس تخلیق کو مسلسل ہونا چاہئے۔ اگر یہ تخلیق مسلسل ور برقرار نہیں تو جس چیز کو ہم مادہ کہتے ہیں اسے غائب ہو کر کھو جانا چاہئے۔ مادے کو ٹیلی ویژن کی سکرین پر آنے والی تصویر سے بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے جو صرف اس وقت تک نظر آتی ہے جب تک نشریات جاری رہتی ہیں۔ چنانچہ وہ کون ہے جو ہماری روح کو ستارے، زمین، پودے اور ہمارا اپنا جسم دکھاتا ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ ایک خالق اعلیٰ وجود رکھتا ہے جس نے ساری مادی کائنات یعنی مجموعہ ادراک تخلیق کیا اور جو اپنی اس تخلیق کو مٹنے نہیں دیتا جو خالق اس قدر شاندار تخلیق کا اظہار کر سکتا ہے وہ یقیناً ابدی طاقت اور قدرت کا مالک ہے۔

یہ خالق ہمیں اپنا تعارف کرواتا ہے۔ اس نے احساسات کی کائنات کے اندر ایک کتاب تخلیق کی ہے۔ اس نے اس کتاب کی وساطت سے ہمیں اپنے، کائنات اور ہماری موجودگی کے جواز کے بارے میں بتایا ہے۔ یہ خالق اللہ ہے اور اس کی کتاب کا نام قرآن ہے۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝

اور تم اس وقت کی (حالت کو) دیکھا کرتے ہو اور ہم اس (مرنے والے) سے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو نظر نہیں آتے۔ (سورۃ واقعہ ۸۳-۸۵)

یہ حقائق کہ آسمان اور زمین یعنی یہ کائنات بے ثبات ہے، ان کی موجودگی تخلیق الٰہی کے سبب ممکن ہوئی ہے اور تخلیق کے اختتام پر یہ سب ختم ہو جائے گا مندرجہ ذیل آیت میں بیان کیے گئے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝

خدا ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے رکھتا ہے کہ ٹل نہ جائیں اگر وہ ٹل جائیں تو خدا کے سوا کوئی ایسا نہیں جو ان کو تھام سکے۔ بیشک وہ بردبار (اور) بخشنے والا ہے۔ (سورۃ فاطر:۴۱)

جیسا کہ ہم آغاز میں بیان کر چکے ہیں کہ کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے وجود کی فہم نہیں اور وہ اسے آسمانوں میں کہیں موجود کوئی وجود خیال کرتے ہیں جو زمینی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ اس منطق کی بنیاد دراصل اس طرز فکر پر ہے کہ کائنات مادے کا مجموعہ ہے اور اللہ اس مادی دنیا سے "باہر" کسی دور دراز مقام پر ہے۔ کچھ باطل مذاہب میں اللہ تعالیٰ پر عقیدہ اسی فہم تک محدود ہے۔

تاہم، جیسا کہ ہم نے اب تک دیکھا ہے مادہ صرف حسیات کا مرکب ہے اور واحد مطلق شے خدا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ واحد شے جو موجود ہے وہ خدا ہے باقی سب وجود غیر حقیقی ہیں۔ اللہ یقیناً ہر جگہ ہے اور کل پر محیط ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا مادے سے باہر ایک علیحدہ وجود کے طور پر ادراک ممکن نہیں۔ قرآن میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ

كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝

خدا (وہ معبود برحق ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ زندہ، ہمیشہ رہنے والا، اُسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے کون ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس سے (کسی کی) سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے۔ اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے (اسی قدر معلوم کرا دیتا ہے) اس کی بادشاہی (اور علم) آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے اور اسے ان کی حفاظت کچھ بھی دشوار نہیں، وہ بڑا عالی رتبہ اور جلیل القدر ہے"۔ (سورۃ البقرہ: ۲۵۵)

اللہ تعالیٰ کے مکان میں محدود نہ ہونے اور کل پر محیط ہونے کو ایک اور آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

اور مشرق اور مغرب سب خدا ہی کا ہے تو جدھر تم رخ کرو ادھر خدا کی ذات ہے۔ بیشک خدا صاحب وسعت اور باخبر ہے۔ (سورۃ البقرہ: ۱۱۵)

چونکہ مادی وجودوں میں سے ہر ایک صرف ادراک ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے لیکن اللہ اپنے پیدا کئے ہوئے مادے کو ہر شکل میں دیکھ سکتا ہے۔ قرآن میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝

(وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے اور وہ بھید جاننے والا اخبردار ہے۔ (سورۃ الانعام: ۱۰۳)

یعنی کہ ہم اللہ تعالیٰ کے وجود کا اپنی آنکھوں سے ادراک نہیں کر سکتے لیکن اللہ ہمارے باطن، خارج، ہماری نگاہ اور فکر میں موجود ہے ہم کوئی ایسا لفظ نہیں بول سکتے اور نہ ایسا سانس لے سکتے ہیں جو اس کے علم میں نہ ہو۔

اگرچہ ہم اپنی زندگی میں ان حسی ادراکات کو دیکھتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہمارے قریب نہیں۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔

اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو خیالات اُس کے دل میں گزرتے ہیں ہم اُن کو جانتے ہیں۔ اور ہم اُس کی رگِ جان سے بھی اُس سے زیادہ قریب ہیں۔ (سورۃ ق:۱۶)

جب کوئی شخص یہ سوچتا ہے کہ اس کا جسم مادے سے بنا ہوا ہے تو وہ دراصل اس اہم حقیقت کی تفہیم نہیں رکھتا۔ اگر وہ اپنے دماغ کو خود اپنا آپ خیال کرتا ہے تو پھر جسے وہ خارج کہتا ہے اس سے بیس تیس سینٹی میٹر کے فاصلے پر ہے تاہم جب وہ سمجھ لیتا ہے کہ مادے جیسی کوئی چیز موجود نہیں اور ہر چیز محض تخیل ہے تو پھر خارج، باطن اور دور نزدیک کی اصطلاحات بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر محیط ہے اور اس کے لامحدود طور پر قریب ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۝

اور (اے پیغمبرؐ) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہیے کہ میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک رستہ پائیں۔ (سورۃ البقرۃ:۱۸۶)

ایک اور آیت میں یہ حقیقت اس طرح بیان ہوئی ہے:

انسان کی ایک اور فکری غلط فہمی یہ ہے کہ اس کے قریب ترین وہ خود ہے۔ لیکن، دراصل، اللہ انسانوں سے خود ان کی نسبت زیادہ قریب ہے۔ اس قرآنی آیت میں ہمیں اسی حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے:

وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ۝

اور تم اس وقت کی (حالت کو) دیکھا کرتے ہو اور ہم اُس (مرنے والے) سے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو نظر نہیں آتے۔ (سورۃ الواقعہ:۸۳-۸۵)

یعنی کہ لوگ ان مدرک الحواس یعنی مظہری حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں کیونکہ وہ اسے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔ دوسری طرف انسان کے لئے ایسی کسی طاقت اور ارادے کا حصول یا اظہار ناممکن ہے جو خدا پر منحصر نہ ہو کیونکہ یہ خود محض ظلی مخلوق ہے۔ قرآن کی آیت وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ

وَمَا تَعْمَلُوْنَ o

حالانکہ تم کو اور جو تم بناتے ہو اس کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ (سورۃ الصآفات: ۹۶)

سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے تجربے میں آنے والی ہر چیز اختیار خداوندی کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ قرآن میں اس حقیقت کا بیان ذیل کی آیت میں کیا گیا ہے:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ o

تم لوگوں نے ان (کفار) کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا اور (اے محمدؐ) جس وقت تم نے کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔ اس سے یہ غرض تھی کہ مومنوں کو اپنے (احسانوں) سے اچھی طرح آزمالے بیشک خدا سنتا جانتا ہے۔ (سورۃ الانفال: ۱۷)

یعنی کہ کوئی عمل بھی اللہ تعالیٰ پر غیر منحصر یعنی اس ذات سے آزادانہ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ چونکہ انسان کا وجود صرف ظلی ہے اس سے پھینکے جانے کا عمل سرزد نہیں ہوسکتا۔ تاہم اللہ تعالیٰ اس ظلی وجود کو احساس ذات دیتا ہے۔ درحقیقت تمام افعال اسی ذات سے سرزد ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی خیال کرتا ہے کہ جو کچھ اس سے سرزد ہو رہا ہے، اس کا اپنا ہے تو وہ خود فریبی میں مبتلا ہے۔

صرف یہی حقیقت ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی شخص اسے قبول نہ کرے اور خود کو اللہ تعالیٰ سے علیحدہ اور متشخص وجود خیال کرلے لیکن حقیقت تبدیل نہیں ہوگی۔ اور بلاشبہ یہ غیر دانشمندانہ انکار بھی دراصل اللہ تعالیٰ کی مرضی اور خواہش سے ہوگا۔

آپ کی ہر چیز بہ نفسہٖ یعنی اپنی ذات میں وہم وگمان ہے

جیسا کہ اب تک آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ ''خارجی دنیا'' کی سائنس اور منطقی ہر دو اعتبار سے، کوئی مادی حقیقت نہیں اور یہ محض شبیہوں کا ایک مجموعہ ہے جو اللہ تعالیٰ ہماری روح پر مسلسل نازل کر رہا ہے۔ بلاشبہ لوگ عموماً ''خارجی دنیا'' کے تصور میں ہر چیز شامل نہیں کرتے یا کرنا نہیں چاہتے۔

اگر ہم آزادانہ اور جرأت مندانہ طور پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ہمارے تمام رشتے ناطے اور مال و منال اسی خارجی دنیا کی شبیہیں ہیں جو ہمارے سامنے لائی جارہی ہیں۔ ہر چیز جس کا ادراک آپ کے حواس خمسہ کرسکتے ہیں دراصل اسی تخیلی دنیا کا حصہ ہے۔ بس یہی امر ایک

حقیقت ہے باقی ہر چیز انسان کی آزمائش کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ انسانوں کی محدود زندگی میں وہ انہی بے حقیقت مجموعہ ادراکات سے آزمائے جاتے ہیں۔ ان کو ایک مقصد کے تحت اتنا پر فریب اور دلکش بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن میں یہ عمل اس طرح مذکور ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۝

لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں (مگر) یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں۔ اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔

(سورۃ آل عمران:۱۴)

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دولت اور آرام و آسائش کے حصول اور اسے اپنی ملکیت میں رکھنے کے لئے اپنا مذہب تیاگ دیتے ہیں۔ وہ حیات بعد از موت کو بھول کر اپنی ساری توجہ اسی دنیا پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ لوگ اس دنیا کی زندگی کے "پر فریب اور بظاہر خوبصورت" حسن کے دھوکہ میں آجاتے ہیں اور نظریات، مصروفیات اور ذمہ داریوں کی آڑ میں نماز، زکوٰۃ اور دوسری عبادات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی زندگی صرف اسی دنیا کی خوشحالی کے لئے گزار دیتے ہیں۔ ذیل کی آیت میں اسی غلط تصور کو بیان کیا گیا ہے۔

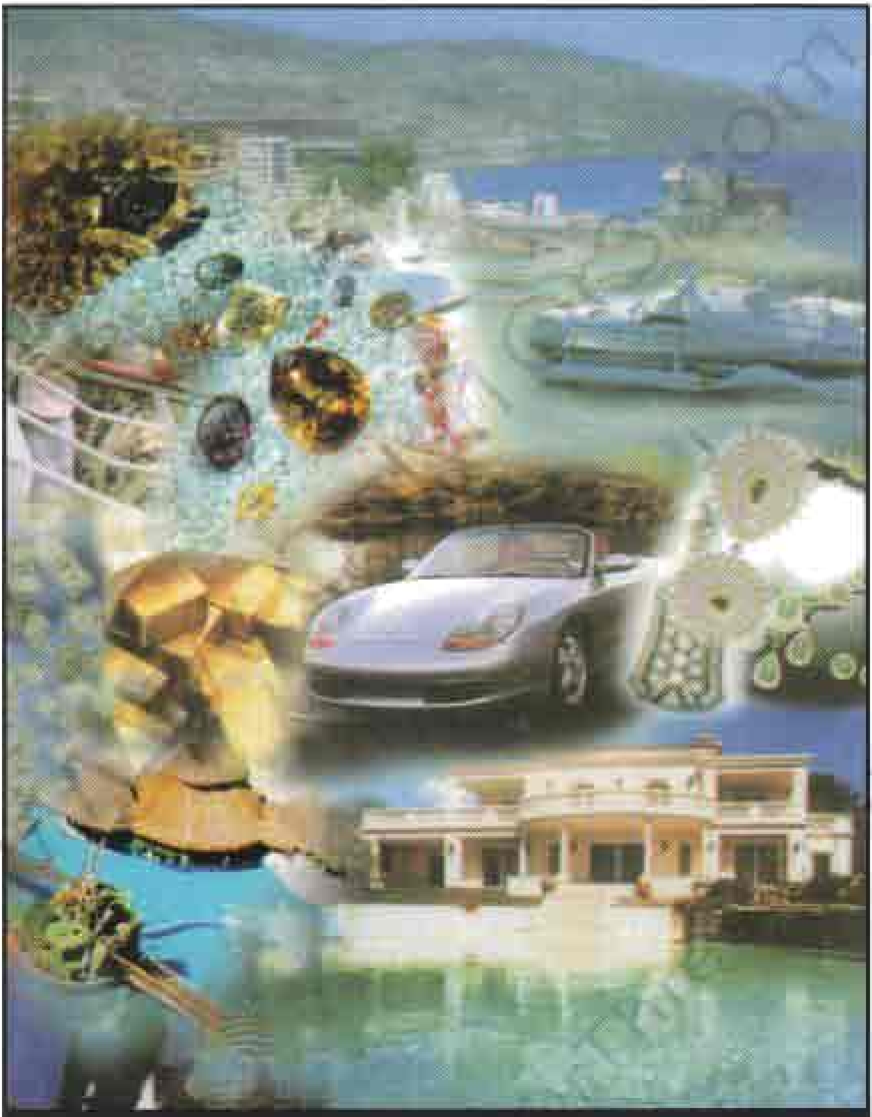
يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ښ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۝

یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں اور آخرت (کی طرف) سے غافل ہیں۔

(سورۃ روم:۷)

اس باب میں بیان کی گئی حقیقت کہ ہر چیز تخیلی ہے، کے مضمرات نہایت اہم ہیں کیونکہ اس کی رو سے تمام سرحدیں اور ہر حرص و ہوا بے معنی ہو جاتی ہے۔ چونکہ ہر تعلق، ہر کامیابی اور ہر کارنامہ محض تخیلی ہے۔ اس لئے ان کے حصول اور استقرار کے لئے کی گئی کوشش، صرف کیا گیا وقت اور کی گئی لالچ کی کوئی افادیت نہیں۔

خواب کو حقیقت سے کیا چیز جدا کرتی ہے، دونوں اشیاء دراصل ذہن میں واقع ہو رہی ہیں۔ اگر ہم خواب میں غیر حقیقی کے حقیقی ہونے کا تجربہ کر سکتے ہیں تو جس دنیا میں ہم رہتے ہیں،



اگر کوئی ان گزارشات پر غور کرے تو فوراً اس حیران کن غیر معمولی نتیجے پر پہنچے گا کہ دنیا کے تمام واقعات ماسوائے تخیل کے اور کچھ نہیں۔

اس کے لئے بھی یہ حقیقی ہو سکتے ہیں۔ جب ہم خواب سے جاگتے ہیں تو یہ ماننے میں کوئی منطق مانع نہیں کہ ہم دراصل اب ایک نسبتاً لمبے خواب میں داخل ہوئے ہیں جسے ہم حقیقی دنیا کہتے ہیں۔ خواب کو غیر حقیقی اور جاگنے کو حقیقی کہنا ہماری جانبداری اور تعصب کی پیداوار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ اپنے مال و دولت اور منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کو حقیقی طور پر موجود





تمہارے لئے حقیقت وہ ہے جسے ہاتھ سے چھوا اور آنکھوں سے دیکھا جاسکے۔ خواب میں بھی آپ "ہاتھ" سے چھو اور آنکھ سے "دیکھ" سکتے ہیں حالانکہ خواب کی حقیقت یہ ہے کہ نہ چھونے کو ہاتھ موجود ہیں اور نہ ہی دیکھنے کو آنکھ۔ اور پھر وہ چیز بھی موجود نہیں جسے دیکھنا اور چھونا مقصود ہے۔ ان واقعات کا سوائے آپ کے دماغ کے اندرون میں کسی اور جگہ کوئی وجود نہیں۔

مان کر اپنے آپ کو انجانے میں بیوقوف بناتے ہیں۔ اپنے معاشرتی مراتب اور عہدوں پر اترانے والے یہ لوگ خود کو باقی تمام مخلوق سے برتر سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اُن کی اس ساری کامیابی کا سبب یہ ساری چیزیں ہیں۔ ذرا سوچئے اگر انہیں یہ پتہ چلے کہ یہ سب کچھ سوائے وہم و تخیل کے اور کچھ نہیں تو ان کی کیا حالت ہوگی۔ دراصل ہر شخص خوابوں میں اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ خوابوں میں ہم لاکھوں روپے کی قیمتی گاڑیوں اور گھروں کے مالک بن جاتے

ہیں لیکن یہ سب کچھ محض فریب ہے۔ جس طرح خواب میں حاصل ہونے والی ملکیت پر اترانا مضحکہ خیز عمل ہے اس طرح اس دنیا کی ملکیتوں پر اترانا بھی کوئی دانشمندانہ فعل نہیں کیونکہ اس دنیا کی تمام اشیاء خوابوں کی طرح صرف ہمارے ذہنی ادراکات ہیں۔

اسی طرح لوگ دنیا میں پیش آنے والے واقعات پر جس ردعمل کا اظہار کرتے ہیں وہ حقیقت حال کا علم ہونے پر باعث شرمساری ہوتا ہے۔ لڑنے جھگڑنے والوں، دھوکہ دینے والوں، جعلسازی کرنے والوں، جھوٹ بولنے والوں، حسد کرنے والوں اور اپنے مال ومنال اور درجہ ورتبہ پر غرور کرنے والوں کو یہ پتہ چلے کہ سارے افعال عالم خواب کے تھے تو انہیں کس درجہ شرمساری ہوگی۔

اور چونکہ یہ سب شبیہیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی ہیں اس لئے وہی ہر چیز کا حتمی مالک ہے۔ قرآن پاک میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا

اور آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے، اور خدا ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ (سورۃ نساء: ۱۲۶)

چنانچہ تخیلی ملکیتوں اور ہیولوں کے لئے مذہب کو پس پشت ڈالنا اور ابدی زندگی میں نقصان اٹھالینا جسے ہمیشہ رہنا ہے دانشمندی نہیں۔

اس مرحلے پر ایک نقطہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ہم نے ابھی تک جو کچھ بیان کیا اس سے یہ مقصود نہیں کہ آپ کے تمام تر علائق اور کامیابیاں بے معنی ہیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے آپ کی تمام تر کامیابیاں، علائق اور ملکیتیں، خواب اور خواہشیں، عزائم اور ہمتیں دراصل صرف خواب ہیں اور ان شبیہوں سے مرکب ہیں جو اللہ آپ پر آزمائش کے لئے نازل کرتا ہے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان دو بیانوں میں کتنا فرق ہے۔

اگرچہ کوئی بھی اس حقیقت کو آسانی سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا اور ان اشیاء کو حقیقی طور پر موجود فرض کر کے خود فریبی کا شکار ہوتا رہے گا لیکن اُسے بالآخر مرنا ہے اور یہ سب کچھ اس پر دوبارہ اٹھائے جانے پر عیاں ہو جائے گا۔ اس دن

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاۗءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ

(یہ وہ دن ہے کہ) اس سے تو غافل ہو رہا تھا۔ اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ (سورۃ ق:۲۲)

وہ ہر چیز واضح طور پر دیکھ لے گا۔ تاہم اگر اس نے اپنی زندگی ان تخیلی عزائم کے تعاقب میں گزاری ہے تو وہ خواہش کرے گا کہ اے خدا کاش میں پیدا نہ ہوا ہوتا۔

يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ○ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ○ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ○

اے کاش موت (ابدالآباد کے لئے میرا کام) تمام کر چکی ہوتی۔ آج میرا مال میرے کچھ بھی کام نہ آیا، (ہائے) میری سلطنت خاک میں مل گئی۔ (سورۃ الحاقہ:۲۷-۲۹)

تاہم ایک دانشمند آدمی کو اس دنیا کی مہلت سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اس کائنات کی عظیم ترین حقیقت کو پالے۔ بصورت دیگر اس کی ساری زندگی خوابوں کے تعاقب میں گزرے گی اور آخر میں المناک سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔ قرآن حکیم میں ایسے لوگوں کا حتمی اور آخری حال بیان کیا گیا ہے جو اس دنیا کی عارضی مہلت کو سرابوں کے تعاقب میں گزارتے ہیں اور اپنے مالک کو بھولے رہتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ ۢبِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اُسے پانی سمجھے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئے تو اسے کچھ بھی نہ پائے اور خدا ہی کو اپنے پاس دیکھے تو وہ اس کا حساب پورا پورا چکا دے، اور خدا جلد حساب کرنے والا ہے۔ (سورۃ نور:۳۹)

مادیت پرستوں کی منطقی کوتاہیاں

اس باب کے آغاز میں واضح طور پر بتایا اور ثابت کیا گیا ہے کہ مادیت پرستوں کے دعویٰ کے برعکس مادہ وجودِ مطلق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ حسیات اور ادراکات کا مجموعہ ہے۔ مادیت پسند نہایت غیر منطقی طور پر اس کھلی حقیقت سے انکار کرتے ہیں اور بے بنیاد نظریے پر اڑے رہتے ہیں۔ بصورت دیگر اُن کا اپنا فلسفہ ابطال کا شکار ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر بیسویں صدی میں فلسفۂ مادیت کا سب سے بڑا مؤید اور کٹر مارکسسٹ

جارج پولٹزر George Politzer بس کی مثال کو مادے کے وجود کا عظیم ترین ثبوت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مادے کو محض ادراک ماننے والے فلسفہ دان بھی بس آتی دیکھ کر راستہ چھوڑ دیتے ہیں اور یہی مادے کے طبعی وجود کا ایک ثبوت ہے۔

جب ایک اور مشہور مادیت پسند جانسن کو بتایا گیا کہ مادہ محض مجموعہ ادراکات ہے تو اس نے پتھروں کا مادی وجود ثابت کرنے کے لئے انہیں ٹھوکر دے ماری۔

ایسی ہی ایک مثال پولٹزر کے سرپرست اور جدلیاتی مادیت کے بانیوں میں سے ایک فریڈرک اینگلز نے بھی دی ہے کہ "اگر کیک جو ہم نے کھائے ہیں محض ادراکات ہوتے تو ہماری بھوک کا تدارک نہ کرتے"۔

جملہ بازی کی ایسی بہت سی اور مثالیں بھی ہیں جو مشہور مادیت پسندوں مارکس، اینگلز، لینن اور انہی جیسے دوسرے مادیت پسندوں کی کتابوں میں ملتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کے منہ پر تھپڑ رسید کیا جائے تو آپ کو مادے کی تفہیم ہو جائے گی۔ اس قسم کی جملہ بازی دراصل مادیت پسندوں کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے جس میں وہ 'مادہ ایک ادراک ہے' کو 'مادہ روشنی کا ایک شعبدہ ہے' کے طور پر لیتے ہیں۔ دراصل وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ادراک کا تصور صرف بصارت تک محدود ہے جبکہ لامسہ جیسے ادراک لازماً کوئی طبعی مناسبت رکھتے ہیں۔ ایک انسان سے ٹکرانے والی بس کو دیکھ کر وہ کہتے ہیں "دیکھو اس نے کچل دیا اس لئے یہ ادراک نہیں" لیکن جو بات وہ سمجھ نہیں سکتے وہ یہ ہے کہ بس سے کچلے جانے میں جن ادراکات کا تجربہ ہوتا ہے وہ سب دماغ میں تشکیل پاتے ہیں۔

خوابوں کی مثال

اس حقیقت کی بہترین مثال خواب ہیں۔ کسی شخص کو آنے والے خواب حقیقت نما واقعات پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ وہ گر کر اپنی ٹانگ تڑوا سکتا ہے اور کیک کھا کر سیر ہو سکتا ہے۔ جو واقعات ہمیں روزمرہ زندگی میں نظر آتے ہیں وہ خواب میں بھی وقوع پذیر ہو سکتے ہیں اور اسی قسم کے احساسات وجذبات کو جنم دے سکتے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ بس سے ٹکرانے والے شخص کی ٹانگ ٹوٹے اور جب ہسپتال میں اس کی آنکھ کھلے تو یہ بھی خواب ہی کا حصہ ہو اور خواب ہی میں وہ اپنے آپ کو معذور خیال کرنے لگے۔ لیکن یہ سب کچھ بہرحال خواب ہی ہوگا۔ وہ خواب میں یہ بھی دیکھ سکتا ہے کہ وہ مر گیا ہے۔ موت

کے فرشتے اس کی روح کو لے گئے ہیں اور حیات بعد از موت کا آغاز ہو گیا ہے۔

اس شخص نے خواب میں تمام تر آوازوں، شبیہوں، روشنیوں اور چیزوں کی سختی نرمی کا علیحدہ علیحدہ اور واضح ادراک کیا۔ خواب میں اس کے یہ سارے ادراکات اتنے ہی فطری ہیں جتنے ''حقیقی'' زندگی میں ہوتے ہیں۔ جو کیک اس نے کھایا اور اس کی تشفی ہوئی یہ صرف ایک ادراک تھا کیونکہ تشفی ہونا بھی دراصل ادراک ہی ہے جبکہ اصل میں یہ شخص اس لمحے اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ حالت خواب میں اس شخص نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا خارجی دنیا میں موجود نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے خوابوں کے خارجی دنیا میں کوئی مناسبات نہیں۔ اس نتیجے سے واضح طور پر انکشاف ہوتا ہے کہ خارجی دنیا صرف ادراکات پر مشتمل ہے۔

مادیت پسند فلسفہ دان، اور خصوصاً مارکسسٹ مادے کی اصلیت بتائے جانے پر ناراض ہو جاتے ہیں وہ جذباتی ہو کر مارکس، اینگلز یا لینن کی سطحی دلیل بازی پر اتر آتے ہیں۔

تاہم ان افراد کو سوچنا چاہئے کہ وہ یہ بیان بازی خوابوں میں بھی کر سکتے ہیں۔ اپنے خوابوں میں وہ داس کیپٹل (Das Capital) پڑھ سکتے ہیں، میٹنگیں کر سکتے ہیں، پولیس سے لڑ سکتے ہیں، سر پر زخم کھا سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان زخموں کا درد محسوس کر سکتے ہیں۔ اگر ان سے خواب میں پوچھا جائے تب بھی وہ سوچیں گے اور مادے کو مطلق کہیں گے بالکل ایسے ہی جیسے وہ خود حالت بیداری میں اپنے آپ کو مطلق مادے پر مشتمل خیال کرتے ہیں۔ تاہم حقیقت یہی ہے کہ وہ عالم خواب اور عالم بیداری میں جو کچھ دیکھتے، سنتے یا محسوس کرتے ہیں سب محض ادراکات پر مشتمل ہے۔

اعصاب کو باہم متوازی ترتیب میں ملانے کی مثال

آیئے پولٹزر (Politzer) کی کار حادثے کی مثال کو ایک بار پھر زیر غور لاتے ہیں۔ اگر حادثے کا شکار ہونے والے اس شخص کے اعصاب کو متوازی ترتیب میں اپنے گھر بیٹھے پولٹزر کے دماغ سے منسلک کر دیا جائے تو بس حادثے کے نتیجے میں اسے بھی درد محسوس ہوگا۔ مطلب یہ کہ حادثے کا شکار ہونے والے شخص کے تمام احساسات اور تجربات میں پولٹزر بھی شریک ہوگا۔ پولٹزر کو کار آتی، جسم سے ٹکراتی، ہڈیوں کے ٹوٹنے اور آپریشن روم میں داخل ہونے کے سب احساسات اور تجربات محسوس ہوں گے۔

پولٹزر کا سا حال ہر اُس شخص کا ہوگا جس کے دماغ کے ساتھ مذکورہ بالا شخص کے اعصاب متوازی ترتیب میں جوڑ دیئے جائیں اگر وہ شخص بے ہوش ہوجاتا ہے تو یہ بھی بے ہوش ہوجائے گا۔ اگر حادثے کے اوقات ریکارڈ کر لئے جائیں اور پھر برقی اشاروں کی صورت کسی شخص کے دماغ کو بھیجے جائیں تو بس اس شخص سے اُتنی ہی مرتبہ ٹکرا سکتی ہے جتنی بار ان پیغامات کی ترسیل کی جائے گی۔

تو پھر ان لوگوں سے ٹکرانے والی کونسی بس حقیقی ہے۔ فلسفہ مادیت کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ درست جواب یہ ہے کہ وہ سب کار کے حادثے سے بمع اس کی تمام تر جزئیات سے صرف اپنے دماغ میں دوچار ہوتے ہیں۔

پتھر اور کیک کی مثال پر بھی اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے اگر اینگلز کے اعصاب کسی دوسرے شخص کے دماغ سے متوازی ترتیب میں منسلک کر دیئے جائیں اور پھر اینگلز کو کیک کھلا کر سیر شکم کر دیا جائے تو وہ دوسرا شخص بھی خود کو سیر شکم محسوس کرے گا۔ اسی طرح اگر جانسن کے اعصاب کسی دوسرے شخص کے دماغ سے منسلک کر دیئے جائیں تو پتھر کو ٹھوکر مارتے پر جانسن کو محسوس ہونے والا درد اُس دوسرے شخص کو بھی محسوس ہوگا۔

تو پھر کونسا کیک اور کونسا پتھر اصلی ہوا۔ مادی فلسفہ ایک بار پھر اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ اس کا درست جواب یہ ہے۔ اینگلز اور دوسرے شخص ہر دو نے کیک اپنے ذہنوں میں کھایا اور شکم سیر ہوئے اور جانسن اور اُس دوسرے شخص نے بھی پتھر لگنے کا تجربہ اپنے ذہن میں کیا اور وہیں درد بھی محسوس کیا۔

آیئے پولٹزر والی مثال میں ایک تبدیلی کرتے ہیں۔ ہم بس حادثے کا شکار ہونے والے شخص کے اعصاب پولٹزر کے دماغ سے منسلک کر دیتے ہیں اور گھر میں بیٹھے پولٹزر کے اعصاب اُس شخص کے دماغ سے۔ اس صورت میں پولٹزر اپنے گھر میں بیٹھا سوچے گا کہ بس نے اسے کچل دیا ہے جبکہ بس سے ٹکرانے والا شخص سوچے گا کہ وہ پولٹزر کے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ اسی منطق کا اطلاق کیک اور پتھر والی مثالوں پر بھی کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے حواس سے آگے نکل جائے اور اُن سے آزاد ہوکر کچھ سوچ سکے یا محسوس کر سکے۔ اسی طریقے سے انسان کی روح مادی وجود اور مادی وزن کی عدم موجودگی میں بھی ہر قسم کے مظاہر اور مناظر سے متاثر ہوسکتی ہے لیکن کوئی شخص اس

حقیقت کو محسوس نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے فرض کر لیا ہے کہ حقیقی ہونے کے لیے سہ جہتی شبیہ کا ہونا ضروری ہے۔ وہ شخص ان شبیہوں کے حقیقی اشیاء ہونے پر مطلق یقین رکھتا ہے کیونکہ وہ مکمل طور پر ان ادراکات کا محتاج ہے جو اعضائے حس کے برقی اشاروں سے پیدا ہوتے ہیں۔

مشہور برطانوی فلسفہ دان ڈیوڈ ہیوم (David Hume) اس حقیقت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے سچ تو یہ ہے کہ جب میں اپنے آپ کو اس میں شامل کرتا ہوں جسے میں اپنی ذات کہتا ہوں تو میرا واسطہ ہمیشہ ان ادراکات سے پڑتا ہے جو ٹھنڈے یا گرم، روشنی یا سایہ، محبت یا نفرت اور کھٹے یا میٹھے جیسی اصلاحات سے منسلک ہیں، ادراکات کے وجود کے بغیر میں خود کو ایک خاص لمحے پر کبھی نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی میں اس کے بغیر کسی چیز کا مشاہدہ کر سکتا ہوں۔

دماغ میں ادراکات کی تشکیل فلسفہ نہیں بلکہ ایک سائنسی حقیقت ہے

مادیت پسند فلسفہ دان کہتے ہیں کہ ہماری اب تک کی ساری بحث محض ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر ہے۔ تاہم "خارجی دنیا" کا مجموعۂ ادراکات ہونا فلسفیانہ مسئلہ نہیں بلکہ ایک سادہ سائنسی حقیقت ہے۔ دماغ میں شبیہوں کا بننا اور محسوس ہونا میڈیکل کے سارے سکولوں میں تفصیل سے پڑھایا جاتا ہے۔ ان حقائق کو بیسویں صدی کی سائنس اور خصوصاً طبیعات ثابت کر چکی ہے۔ مادے کی کوئی مطلق حقیقت نہیں اور ہر شخص ایک حوالے سے اپنے دماغ میں لگی ٹی وی سکرین کو دیکھ رہا ہے۔

سائنس کو ماننے والا ہر شخص خواہ وہ دہریہ ہو یا بدھ یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ مادیت پسند خالق کی موجودگی سے انکار کر سکتا ہے لیکن وہ اس سائنسی حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا۔

اگرچہ اُس وقت سائنسی علم اور طریقہ کار ناکافی تھے لیکن پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ کارل مارکس (Marx)، اینگلز (Engles) اور پولٹزر (Politzer) اتنی سادہ اور کھلی حقیقت کو کیوں سمجھ نہ سکے۔ ہمارے دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں کافی ترقی ہو چکی ہے اور حالیہ ایجادوں نے اس حقیقت کو سمجھنا آسان کر دیا ہے۔ مادیت پسند خوفزدہ ہیں کہ اگر یہ حقیقت عام ہو گئی تو اُن کا فلسفہ منہدم ہو جائے گا۔

مادیت پسندوں کا خوف

اس کتاب میں بیان کی گئی حقیقت یعنی مادے کے محض ادراک ہونے پر ترک مادیت پسندوں کے حلقوں سے ابھی تک کوئی بڑا ردِّعمل سامنے نہیں آیا۔ اس سے ہمیں تاثر ملتا ہے کہ ہم اپنا نقطہ نظر اچھی طرح واضح نہیں کر سکے اور اس حوالے سے مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ جلد ہی واضح ہو گیا تھا کہ مادیت پسندوں کو اس نقطہ نظر کے پھیلنے اور مقبول ہونے سے بے چینی کا سامنا ہے اور وہ اس سے خوفزدہ ہیں۔ کچھ عرصے سے مادیت پرست اپنی اس بے چینی اور خوف کا اظہار مطبوعات اور کانفرنسوں کی صورت کر رہے ہیں۔ اُن کا مشتعل اور مایوس کن طرزِ عمل بتاتا ہے کہ وہ شدید دانشورانہ بحران کا شکار ہیں۔ اُن کے نظریے کی نام نہاد بنیاد یعنی ارتقاء کا سائنسی ابطال پہلے سے ہو چکا ہے اور یہ اُن کے لئے بہت بڑا صدمہ ہے۔ اب وہ محسوس کر رہے ہیں کہ مادہ بھی اُن کے ہاتھ سے نکل رہا ہے جو ڈارون سے بڑا سہارا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ مسئلہ اُن کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے جو اُن کے تمدن کے تار پود بکھیر دے گا۔

مادیت پسندوں کے اس اضطراب اور خوف کا بیباک ترین اعتراف رینان پیکونولو (Renan Pekunulu) نے کیا ہے۔ رینان سائنس اور یوٹوپیا (Science and Utopia) نامی رسالے میں باقاعدگی سے لکھتے ہیں۔ یہ رسالہ بنیادی طور پر مادیت پسندی کے نظریہ کا ترجمان اور محافظ ہے۔ اپنے مضامین اور علمی رسالے میں رینان نے بیان کیا ہے کہ Evolution Deceit نامی کتاب مادیت کے نظریے کو سب سے بڑا خطرہ ہے۔ رینان کے اضطراب کا سبب صرف وہ ابواب نہیں جو ڈارون ازم کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ عبارت بھی ہے جو آپ نے اوپر ملاحظہ فرمائی۔ رینان نے مادیت پسندوں کو درس دیا کہ وہ عینیت پسندی کے ہاتھوں گمراہ نہ ہوں اور نظریہ مادیت پر اپنا یقین برقرار رکھیں۔ اس نے حوالے کے طور پر روس کے خونی انقلاب کے بانی لینن کا نام لیا۔ لینن کی سو سال پرانی کتاب کا حوالہ اور اسے پڑھتے رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے رینان اپنے قارئین سے کہتا ہے کہ بقول لینن ”اس مسئلے پر زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ورنہ آپ نظریہ مادیت کی پٹڑی سے اتر جائیں گے اور مذہب کے راستے پر جا چڑھیں گے“۔ مذکورہ بالا رسالے میں اپنے ایک مضمون میں لینن کا یہ اقتباس نقل کیا:

”ایک بار جب آپ معروضی حقیقت سے انکار کر دیتے ہیں تو نظریہ تیقن کے خلاف اپنے

ہر ہتھیار سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں کیونکہ اس طرح آپ لاادریت یا موضوعیت میں دھنس جاتے ہیں۔ اور یہی سب نظریہ تیقن کی ضرورت ہے۔ ایک بار شکنجہ ڈھیلا ہوا اور پرندہ ہمیشہ کے لئے اڑ گیا۔ ہمارے سب Marxists عینیت میں پھنس چکے ہیں جو عدم تیقن کی سی لطیف سی شکل ہے۔ جب انہوں نے احساس کو بیرونی دنیا کی شبیہہ ماننے کی بجائے ایک خصوصی عنصر مان لیا تھا تو وہ اُسی وقت اس پھندے میں پھنس گئے تھے۔ یہ کسی شخص کا احساس، کسی شخص کا ذہن، کسی شخص کا ارادہ نہیں ہے''۔

ان الفاظ سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ لینن نے خطرہ بھانپ لیا تھا اور وہ اس حقیقت کو اپنے اور کامریڈوں کے دماغ سے نکال دینا چاہتا تھا۔ تاہم یہ خیال آج بھی ہمارے معاصر مادیت پسندوں کو اسی طریقے سے تنگ کر رہا ہے بلکہ ہمارے معاصر مادیت پسند کچھ زیادہ پریشان ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ آج یہی حقیقت سو سال پہلے کی نسبت زیادہ واضح اور زیادہ بہتر اور مدلل انداز میں بیان کی جارہی ہے۔ تاریخ عالم میں پہلی بار اس موضوع کو اتنے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

بلاشبہ عمومی صورت حال یہی ہے کہ مادیت پسند سائنسدانوں کی ایک بہت بڑی تعداد آج بھی اس حقیقت کے خلاف ایک مصنوعی اور سطحی نقطہ نظر اختیار کئے کھڑی ہے کہ ''مادہ سوائے التباس کے اور کچھ نہیں'' اس باب میں جس موضوع کی وضاحت کی گئی ہے عام زندگی میں پیش آنے والے موضوعات میں سے دلچسپ ترین اور اہم ترین ہے۔ اس طرح کا اہم اور نازک موضوع زندگی میں کسی اور جگہ سامنے آنے کا کوئی امکان نہیں تاہم ان سائنسدانوں کا ردِعمل اور اس موضوع پر ان کی تقاریر اور مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی اپنی فہم کتنی سطحی اور کھوکھلی ہے۔

موضوع زیر بحث کا ردِعمل بعض مادیت پرستوں پر اس طرح کا ہوا کہ مادی نظریے کے ساتھ اپنی اندھی وابستگی کے ہاتھوں اُن کی قوت استدلال اور منطقی طرز کار بھی متاثر ہوا۔ چنانچہ وہ اس موضوع کی تفہیم سے بہت دور رہے اس طرح کی ایک مثال ایلانٹن سینگل کی ہے۔ مذکورہ بالا مصنف کی طرح یہ بھی درس و تدریس سے وابستہ ہیں اور Bilin Ve Utopya نامی رسالے کے لئے مضامین لکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ڈاروِن ازم کے انہدام کو بھول جائیں ہمیں درپیش حقیقی خطرہ یہ ہے۔ خود اپنے فلسفے کے بے بنیاد ہونے کا احساس کرتے ہوئے اپنے قاری سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ''جو آپ کہتے ہیں اُسے ثابت کریں'' اس مصنف کے حوالے سے زیادہ دلچسپی کی

بات یہ ہے کہ خود اس کی تحریر سے پتہ چلتا ہے وہ کچھ اس پر واضح نہیں جسے وہ خطرہ قرار دیتا ہے۔

مثال کے طور پر اس نے اپنے ایک مضمون میں صرف اس موضوع پر بحث کی ہے وہ اعتراف کرتا ہے کہ بیرونی دنیا ہمارے دماغ میں بننے والے عکس کے سوا کچھ نہیں تاہم بعد میں وہ دعویٰ کرتا ہے کہ ان عکسوں یا شبیہوں کی دو قسمیں ہیں: وہ شبیہیں جن کے طبعی مناسبات موجود ہیں وہ جن کے طبعی مناسبات موجود نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جن شبیہوں کے طبعی مناسبات موجود ہیں اُن کا تعلق بیرونی دنیا سے ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ ٹیلیفون کی مثال دیتا ہے۔ اس کی تحریر کو خلاصتاً لکھا جائے تو یوں بنتا ہے ''میرے علم میں نہیں کہ میرے دماغ کے تخیل اور شبیہہ کی مناسبات بیرونی دنیا میں موجود ہیں کہ نہیں لیکن اس چیز کا اطلاق اس وقت بھی ہوتا ہے جب میں ٹیلیفون پر بات کرتا ہوں۔ ٹیلیفون پر بات کرتے ہوئے میں دوسرے سرے پر موجود شخص کو نہیں دیکھ سکتا لیکن جب میں بعدازاں اُسے روبرو دیکھتا ہوں تو میرے تخیل کی تصدیق ہو جاتی ہے''۔

مندرجہ بالا عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے مطلب کو کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

''اگر ہمیں اپنے ادراک پر شک ہو تو ہم خود مادے کو دیکھ کر یہ شک دُور کر سکتے ہیں''

لیکن یہ امر بجائے خود تناقص سے ادراک ہے کیونکہ ہمارے لئے خود مادے تک پہنچنا ناممکن ہے۔ ہم اپنے ذہن سے نکل ہی نہیں سکتے کہ ''بیرون'' تک رسائی حاصل کریں۔ فون پر آنے والی آواز کی مناسبت کی تصدیق فون پر موجود شخص سے کی جا سکتی ہے لیکن یہ تصدیق بجائے خود ذہنی تخیلی تجربہ ہوگا۔

درحقیقت یہ لوگ اپنے خوابوں میں بھی اسی طرح کی واردات سے گزرتے ہیں۔ مثال کے طور پر سینل خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ ٹیلیفون پر بات کر رہا ہے اور پھر اپنی بات کی تصدیق فون پر موجود دوسرے شخص سے کرتا ہے یا پھر اسی طرح پیکن لو کو خواب آتا ہے اور وہ سخت خطرہ محسوس کرتے ہوئے لوگوں کو ایک صدی پرانی لینن کی کتاب پڑھنے کی ہدایت کرتا ہے یہ مادیت پسند کچھ بھی کرلیں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ خواب میں ان کا ہر تجربہ اور لوگوں سے کی گئی ہر گفتگو سوائے ادراک کے کچھ نہیں تھی۔

لیکن کوئی شخص کن سے تصدیق کرے گا کہ خواب میں بننے والی شبیہہ کی مناسبات موجود ہیں کہ نہیں؟ کیا وہ یہ تصدیق دماغ میں پڑنے والے عکس سے ہی کرے گا؟ بلاشبہ مادیت پسندوں کو دماغ سے باہر اطلاعات کا کوئی منبع نہیں مل سکتا جو نہیں دماغ کے باہر کی دنیا کے متعلق اطلاعات

فراہم کرے اور پھر ان کی تصدیق بھی کرے۔

یہ مان لینے کے بعد کہ تمام ادراک دماغ میں ہوتے ہیں یہ فرض کرنا کہ دماغ سے باہر جا کر ان ادراکات کی بیرونی دنیا سے تصدیق ہو سکتی ہے، محض منتشر تعقل اور محدود قوت منطق کی علامت ہے۔

لیکن یہاں پر بیان کئے گئے حقائق عام فہم اور معمولی قوت ادراک کے مالک شخص کی ذہنی دسترس سے باہر نہیں۔ کوئی بھی ایسا شخص غیر متعصب ہو کر سوچے تو اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ بیرونی دنیا کے موجود ہونے کی آزمائش حواس کی مدد سے نہیں کی جا سکتی تاہم لگتا ہے کہ مادیت کی اندھی تقلید تعقلی قوتوں کے لئے تباہ کن ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے معاصر مادیت پسند بھی وہی غیر منطقی طریقے اختیار کر رہے ہیں جو ان کے اساتذہ ماضی میں پتھر پھینک کر اور کیک کھا کر کرتے رہے ہیں۔

یہ بھی بیان کیا جانا مقصود ہے کہ یہ صورت حال اتنی حیران کن نہیں ہے۔ فہم و فراست سے عاری ہونا لادینوں کی پرانی صفت ہے۔ قرآن پاک میں خاص انہی کے لئے فرمایا:

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝

اور جب تم لوگ نماز کے لئے اذان دیتے ہو تو یہ اُسے بھی ہنسی اور کھیل بناتے ہیں یہ اس لئے کہ سمجھ نہیں رکھتے۔ (سورۃ المائدہ:۵۸)

مادیت پرست تاریخ کے سب سے بڑے پھندے میں پھنس چکے ہیں

ترکی کے مادیت پرست حلقوں میں پھیلنے والے اضطراب کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ یہ بہت سی موجود مثالوں میں سے صرف ایک ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مادیت پسندوں کو ایک ایسی صورت حال کا سامنا ہے جس کی مثال پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ مادے کے محض ادراک ہونے کی حقیقت کو جدید سائنس نے ثابت کرنے کے لئے نہایت واضح، سیدھے اور پرزور طریقے سے بیان کر دیا ہے۔ مادیت پسندوں کے لئے فقط اتنا بچا ہے کہ وہ اس پوری مادی دنیا کا انہدام خود دیکھ لیں جس پر وہ اندھا دھند انحصار کرتے رہے ہیں۔

مادیت پرستی کے نظریات انسانیت کی تاریخ میں ہمیشہ سے موجود ہیں۔ اپنے آپ پر یقین

اور اپنے فلسفے پر ایمان کے باعث انہوں نے اللہ سے بغاوت کی جس نے انہیں پیدا کیا۔ ان کے تشکیل کردہ منظر نامے کی رو سے مادے کا کوئی آغاز نہیں اور مادے کا نہ ہی کوئی انجام اور اسی لئے مادے کے خالق کا موجود ہونا بھی خارج از امکان ہے۔ اپنی رعونت کے باعث انہوں نے وجودِ الٰہی سے انکار کیا اور مادے میں پناہ لی جس کے متعلق یہ حقیقی طور پر موجود ہونے کی غلط فہمی رکھتے تھے۔ انہیں اپنے فلسفہ پر اتنا یقین تھا کہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس کا برعکس ہونا بھی کبھی ثابت ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ مادے کی ماہیت کے متعلق اس کتاب میں بیان کردہ حقائق ان لوگوں کے لئے اس قدر حیران کن تھے۔ کتاب ہذا میں مذکور حقائق نے ان کے فلسفہ کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور مزید بحث کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ مادہ جس پر ان کے تمام افکار حیات، رعونت اور انکار کی بنیاد تھی اچانک غائب ہو گیا۔ جب مادہ موجود ہی نہیں تو مادیت کیسے موجود رہ سکتی ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

اور (اے محمدؐ اس وقت کو یاد کرو) جب کافر لوگ تمہارے بارے میں چال چل رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا جان سے مار ڈالیں یا (وطن سے) نکال دیں تو (ادھر تو) وہ چال چل رہے تھے اور (اُدھر) خدا چال چل رہا تھا۔ اور خدا سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ (سورۃ الانفال:۳۰)

اللہ تعالیٰ نے مادیت پرستوں کو زیر دام لانے کے لئے انہیں یقین دلوایا کہ مادہ موجود ہے اور جب انہوں نے یقین کر لیا تو پھر انہیں ایک غیر متوقع اور ان دیکھے طریقے سے ہزیمت سے دوچار کیا۔ مادہ پرستوں نے اپنی املاک، مراتب، معاشرے اور پوری دنیا کو موجود جانا اور ان پر انحصار کر کے اللہ کے خلاف رعونت اختیار کی۔ انہوں نے اللہ کے خلاف بغاوت کی، بڑے بول بولے اور یوں ان کی بدعقیدگی بڑھتی چلی گئی۔ اپنے اس سارے عمل میں انہوں نے مادہ پر انحصار کیا لیکن اس سارے عمل کے دوران یہ اتنے بے عقل رہے کہ انہیں خیال تک نہ آیا کہ اللہ انہیں گھیرے میں لے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی ایمان نہ لانے والوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ اپنی کم عقلی کے ہاتھوں کس حالت کو جا پہنچے۔

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ۝

اور اگر یہ آسمان سے (عذاب کا) کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں تو کہیں کہ یہ گاڑھا بادل

ہے۔ (سورۃ الطور:۴۲)

یہ شاید تاریخ کی سب سے بڑی شکست ہے خدا کے خلاف چھیڑی گئی جنگ میں ان مادہ پرستوں کو کھلی اور فاش شکست ہوئی ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۝

اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا کئے کہ ان میں مکاریاں کرتے رہیں، اور جو مکاریاں یہ کرتے ہیں ان کا نقصان انہی کو ہے اور (اس سے) بے خبر ہیں۔
(سورۃ الانعام:۱۲۳)

ایک اور سورت میں اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۝

یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں (کہ کلام خدا ہے، خدا سے) ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔

اللہ پر ایمان نہ لانے والے اُس کے خلاف سازشیں کرتے ہوئے ایک بہت اہم حقیقت کو نظر انداز کر بیٹھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے خلاف سازشیں کرنے والے ان لوگوں کے تمام ادراک خود ان کے لئے پھندا بن جاتے ہیں۔ ان کے سارے منصوبے محض ان کے دماغ میں بننے والی شبیہیں ہیں اپنی حماقت کے ہاتھوں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ کے مقابلے میں وہ تن تنہا ہیں اور خود اپنی سازشوں کا شکار۔

زمانہ قدیم کے ایمان سے خالی لوگوں کی طرح ہمارے عہد میں زندہ بے ایمان لوگوں کو بھی ان حقائق کا سامنا ہے جو ان کے منصوبوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔ آیت

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۝

ہر خبر کیلئے ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ (سورۃ الانعام:۶۷)

میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان منصوبوں کو اُسی دن ناکام کر دیا گیا تھا جس دن یہ بنے تھے۔ اہل ایمان کو نوید دی گئی کہ

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ۝

اگر تمہیں آسودگی حاصل ہو تو ان کو بری لگتی ہے اور اگر رنج پہنچے تو خوش ہوتے ہیں اور اگر تم تکلیفوں کو برداشت اور (ان سے) کنارہ کشی کرتے رہو گے تو ان کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا، یہ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔ (سورۃ آل عمران: ۱۲۰)

بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــــًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ

جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اسے پانی سمجھے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئے تو اسے کچھ بھی نہ پائے اور خدا ہی کو اپنے پاس دیکھے تو وہ اس کا حساب پورا پورا چکا دے، اور خدا جلد حساب کرنے والا ہے۔ (سورۃ نور: ۳۹)

مادیت پسند بھی اس آیت میں بیان کئے گئے اپنے باغیانہ عمل کی وجہ سے سراب بن جاتے ہیں۔ جب یہ اس سے رجوع کرتے ہیں تو انہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ سوائے واہمے کے اور کچھ نہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سراب سے دھوکہ دیا اور عکسوں اور شبیہوں کے اس پورے نظام کو انہیں حقیقی ماننے پر مجبور کر دیا۔ یہ تمام پروفیسرز، فلکیات دان، حیاتیات دان اور طبیعات دان اپنے تمام تر علم اور مقام و مرتبہ سمیت بچوں کی طرح دھوکہ کھا جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے مادے کو اپنا دیوتا مانا۔ انہوں نے شبیہوں کے ایک مجموعے کو مطلق مان لیا اور اس پر اپنے فلسفے اور نظریے کی بنیاد رکھی، اس پر سنجیدہ بحثیں کیں اور پھر نام نہاد دانشورانہ طرز عمل اختیار کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اتنا عقلمند سمجھ لیا کہ کائنات کی حقانیت اور خدا کے ہونے یا نہ ہونے جیسے تنازعے پر اپنی محدود دانش آزمانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی صورت حال کو ذیل کی آیت میں بیان کیا ہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ

اور وہ (یعنی یہود قتل عیسیٰ کے بارے میں ایک) چال چلے اور خدا بھی (عیسیٰ کو بچانے کے لئے) چال چلا اور خدا خوب چال چلنے والا ہے۔ (سورۃ آل عمران: ۵۴)

کچھ منصوبوں سے بچ نکلنا ممکن ہوتا ہے لیکن بدعقیدہ لوگوں کے خلاف اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ اتنا مضبوط ہے کہ اس سے فرار ممکن نہیں۔ وہ چاہے کچھ بھی کر لیں اور کسی سے بھی مدد مانگ لیں سوائے اللہ کے کوئی انہیں مدد دینے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○

تو جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے وہ اُن کو اُن کا پورا بدلہ دے گا اور اپنے فضل سے کچھ زیادہ بھی عنایت کرے گا اور جنہوں نے (بندہ ہونے سے) عار و انکار اور تکبر کیا اُن کو وہ تکلیف دینے والا عذاب دے گا اور یہ لوگ خدا کے سوا اپنا حامی اور مددگار نہ پائیں گے۔ (سورۃ النساء:۱۷۳)

مادہ پرستوں کو ایسے پھندے میں پھنس جانے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ بیسویں صدی کے سارے وسائل دسترس میں ہونے کی وجہ سے وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ نہ صرف اپنے انکار میں مزید سخت ہو جائیں گے بلکہ اور لوگوں کو بھی اس بدعقیدگی میں شامل کرلیں گے۔ کافروں کی یہ ذہنیت اور ان کے انجام کو قرآن پاک کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○

اور وہ ایک چال چلے اور ان کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ تو دیکھ لو کہ اُن کی چال کا انجام کیسا ہوا۔ ہم نے اُن کو اور اُن کی قوم سب کو ہلاک کر ڈالا۔ (سورۃ النمل:۵۰-۵۱)

اس آیت کی روشنی میں دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس میں مادہ پرستوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اُن کی ملک میں شامل ہر چیز محض ایک واہمہ اور التباس ہے۔ چنانچہ وہ جو کچھ رکھتے تھے تباہ کر دیا گیا ہے۔ اُن کی تمام املاک اور تمام آسائشیں جو اُن کے خیال میں اُن کی دسترس میں ہیں دراصل ان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں سورۃ الانعام کی آیت ۵۱ کی رو سے انہیں برباد کر دیا گیا ہے۔ اس موقع پر کہا جا سکتا ہے کہ اب وہ مادہ نہیں محض روح ہیں۔

بلاشبہ اس حقیقت کو مان لینا مادیت پرستوں کے لئے بدترین امر ہے۔ اُن کے اپنے الفاظ میں بات کی جائے تو یہ حقیقت کہ اُن کی ہر چیز سوائے واہمے کے کچھ نہیں اُن کے لئے اسی دنیا میں "مرنے سے پہلے موت" کے مترادف ہے۔

یہ امر انہیں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ○

ہمیں اُس شخص سے سمجھ لینے دو جس کو ہم نے اکیلا پیدا کیا۔ (سورۃ المدثر:۱۱)

ان آیات قرآنی کی روشنی میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہر انسان اکیلا اکیلا کھڑا ہے۔ یہ اہم حقیقت کئی اور آیات میں بھی بیان کی گئی ہے:

اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَکْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَکِّنْ لَّکُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَکْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ۝

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن سے پہلے کتنی اُمتوں کو ہلاک کر دیا جن کے پاؤں ملک میں ایسے جما دیئے تھے کہ تمہارے پاؤں بھی ایسے نہیں جمائے۔ اور اُن پر آسمان سے لگاتار مینہ برسایا۔ اور نہریں بنا دیں جو اُن کے (مکانوں کے) نیچے بہہ رہی تھیں۔ پھر اُن کو اُن کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا اور ان کے بعد اور اُمتیں پیدا کر دیں۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ ۖ لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا۝

انہوں نے کہا کہ میں تو تمہارے پروردگار کا بھیجا ہوا (یعنی فرشتہ) ہوں (اور اس لئے آیا ہوں) کہ تمہیں پاکیزہ لڑکا بخشوں۔ (سورہ مریم:۱۹)

ان حقائق کو بنظر غائر دیکھیں تو یہی مطلب نکلتا ہے: جنہوں نے مادے کو اپنا خدا مانا اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور انہیں اُسی کی طرف لوٹنا ہے، انہوں نے اپنا ارادہ اللہ کے سامنے سرنگوں کر دیا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ایسا کرنا چاہتے تھے کہ نہیں اب وہ روزِ حساب کے منتظر ہیں جب ان سب کا حساب لیا جائے گا۔

نتیجہ

اس وقت تک ہم نے جس مضمون کی وضاحت کی ایسی عظیم سچائیوں سے آپ کو زندگی میں کم ہی واسطہ پڑے گا۔ یہ کائنات کی عظیم ترین حقیقتوں میں سے ایک ہے۔ یہ ثابت کر لینے کے بعد کہ ساری مادی دنیا درحقیقت ایک واہمہ اور سایہ کے سوا کچھ نہیں ہمارے لئے اللہ کے وجود اور اس کی تخلیق اور اس کے قادرِ مطلق اور حقیقت مطلق ہونے کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔

ان حقائق کو سمجھنے والا شخص محسوس کرتا ہے کہ دنیا ہرگز ویسی نہیں جیسی بیشتر لوگوں کو نظر آتی ہے۔ دنیا ایسا مقامِ مطلق نہیں جس کا ایک حقیقی وجود ہو۔ ایسا خیال کرنا انہی لوگوں کے لئے باعث سہولت ہے جو اپنے مال و منال اور مال و دولت پر متفخر ہوتے ہیں اور اپنی زندگیاں کھوکھلے

عزائم کے نام وقف کر دیتے ہیں۔ دنیا محض ادراکات کا مجموعہ اور ایک دھوکہ ہے۔ جن لوگوں کا اوپر ذکر کیا گیا وہ بھی وجود کے نام محض سائے ہیں جو اپنے ذہنوں میں موجود ان ادراکات کو دیکھتے ہیں لیکن وہ خود بھی اس عمل سے آگاہ نہیں۔

یہ تصور بہت اہم ہے کیونکہ یہ مادہ پرستی کے اس فلسفے کی نفی کرتا ہے جو وجودِ خداوندی کا منکر ہے اسی لئے مارکس، اینگلز اور لینن جیسے مادہ پرست مضطرب ہو جاتے ہیں اور اپنے پیروکاروں کو اس پر غور نہ کرنے کو کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ ذہنی ناکارگی کی اُس حالت کو پہنچ چکے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ادراکات دماغ کے اندر منتشر ہوتے ہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ جس دنیا کا مشاہدہ وہ اپنے دماغ میں کرتے ہیں وہی خارجی دنیا ہے۔ وہ اپنی اس فہم کے متضاد سادہ سے حقائق کی تفہیم کی اہلیت سے بھی عاری ہو جاتے ہیں۔

یہ بے خبری دراصل یقین نہ لانے والوں کی قلت عقل کا نتیجہ ہے۔ یہ قلت عقل دراصل اللہ تعالیٰ کے انہیں ملعون قرار دیئے جانے کے باعث ہے۔ انہی کفار کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ

"اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں۔ ان کے دل ہیں لیکن اُن سے سمجھتے نہیں۔ اور اُن کی آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں۔ اور اُن کے کان ہیں پر اُن سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل) چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں"۔

اس مقام کے آگے غور و فکر کے لئے آپ اپنے قوائے ذہنی پر انحصار کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے آپ کو دیکھنا ہوگا کہ آپ اپنی گرد و پیش کی اشیاء کو کس طرح دیکھتے اور قوت لامسہ سے محسوس کرتے ہیں۔ اگر آپ درست خطوط پر آگے بڑھیں تو محسوس کر سکتے ہیں کہ اس کتاب کو دیکھنے، سننے، چھونے، سوچنے اور پڑھنے والی عاقل ہستی دراصل صرف روح ہے جو اُن ادراکات کو پردہ سکرین پر دیکھتی ہے جسے مادہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا ادراک کر لینے والا شخص بیشتر انسانوں کو دھوکہ دینے والے اس مادی جہان کے فریب سے آگے نکل کر حقیقی وجود کے جہان میں داخل ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے بہت سے فلسفہ دانوں نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا۔ امام ربانی محی الدین ابن عربی اور مولانا جامی جیسے مسلم دانشوروں نے قرآنی نشانیوں پر عقلی غور و فکر سے اس حقیقت کو پا لیا تھا۔ جارج برکلے جیسے چند مغربی فلسفہ دان بھی تعقل کی راہ پر چلتے اسی نتیجے پر پہنچے

تھے۔ امام ربانی نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا کہ کائنات کا تمام مادہ صرف مفروضہ یعنی ادراک اور التباس یعنی وہم ہے اور ذات مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

''اللہ تعالیٰ نے التباسات اور محسوسات کے محیط کرّے پیدا کئے۔ وجود کائنات محض کرۂ احساس و التباس تک محدود ہے۔ یہ بجائے خود ٹھوس نہیں بیرون میں سوائے ذات جل جلالہٗ کے کچھ موجود نہیں''۔

امام ربانی نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ انسان کو نظر آنے والی ہر طرح کی شبیہ سوائے التباس کے اور کچھ نہیں اور خارجی دنیا میں ان سے مناسبت رکھنے والی اصل اور حقیقت موجود نہیں۔

''یہ تخیلی دور متخیلہ ہی موجود ہے یہ اس لئے نظر آتا ہے اور اسی حد تک نظر آتا ہے جس حد تک اسے کھینچا گیا ہے اسے صرف ذہن کی آنکھ دیکھتی ہے۔ یہ ہمیں خارج میں یوں نظر آتے ہیں جیسے انہیں سر میں موجود آنکھ دیکھ رہی ہو۔ حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں۔ یہ بالکل آئینے میں نظر آنے والے عکس کی طرح ہے۔ آئینے سے باہر اس عکس کا کوئی تسلسل اور استقرار موجود نہیں۔ تخیل اور اس کا استقرار دونوں تخیلی ہیں اور اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے''۔ تاہم اس حقیقت کے سمجھنے والوں کی تعداد تاریخ میں ہمیشہ محدود رہی ہے۔ امام ربانی جیسے عظیم عالموں نے لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ عوام الناس کو ان حقائق کی تعلیم دینا نامناسب ہو۔ لوگوں کی اکثریت غالباً ان کی تفہیم نہ کر پائے گی۔

مولانا جامی نے اسی حقیقت کو قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں اپنے تدبر کے مطابق اس طرح بیان کیا ہے: ''اس کائنات میں جو کچھ ہے احساسات اور مشاہدات ہیں۔ یہ یا تو عکس کی مانند ہیں اور یا پھر سایوں کی طرح''۔

ہمارے دور میں یہ حقائق تجربے سے ثابت ہو چکے ہیں اور انہیں سائنس نے ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ کائنات کے محض سایہ اور التباس ہونے کی حقیقت کو سائنس نے تاریخ میں پہلی بار نہایت واضح اور کھلے انداز میں بیان کر دیا ہے۔

اسی لئے اکیسویں صدی تاریخ انسانیت میں ایک اہم موڑ بن جائے گی۔ لوگوں میں الہیاتی حقائق کا فہم عام ہو جائے گا اور وہ جوق در جوق اللہ کی طرف رجوع کریں گے جو واحد مطلق ہستی ہے۔ اکیسویں صدی میں انیسویں صدی کے مادہ پرستی کے حقائق کو تاریخ کے کوڑا گھر میں پھینک دیا جائے گا۔ لوگ وجود الہٰی اور تخلیق الہٰی جیسے رموز سے آشنا ہوں گے۔ لازمانیت اور لامکانیت جیسے تصورات سے آشنائی کے بعد لوگوں کی آنکھوں سے دجل وفریب کے صدیوں پرانے پردے ہٹ جائیں گے اور بلاشبہ کسی ظلی وجود کے لئے ممکن نہیں کہ وہ تاریخ کے اس دھارے کے سامنے بند باندھ سکے۔

حصّہ سوم

مقدر کی حقیقت اور وقت کی اضافیت

اُوپر بیان کی گئی ہر شے سے پتہ چلتا ہے کہ ''سہ العبادی فضا'' جیسی کوئی چیز درحقیقت موجود نہیں۔ مزید یہ کہ ادراک سے پیدا ہونے والی ہر انگیخت ہمارے اندر پہلے سے قائم شدہ کسی نظریے کی روشنی میں تعبیر پاتی ہے۔ درحقیقت ہم اپنی پوری زندگی ''لامکانیت'' میں گزارتے ہیں۔ اس کے متضاد کوئی بھی رویہ اختیار کرنا یا کوئی متضاد دعویٰ کرنا ایسے اوہام کے ساتھ ذہنی وابستگی کے مترادف ہوگا جو عقل اور سائنسی سچائی کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس ابھی تک خارجی سہ عبادی دنیا کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

یہ حقیقت اس مادی فلسفے کی تکذیب کرتی ہے جس پر نظریۂ ارتقاء کی بنیاد ہے۔ ان کا مفروضہ یہ ہے کہ مادہ مطلق اور ابدیت کا حامل ہے۔ مادی فلسفے کا دوسرا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ وقت بھی مطلق اور ابدی ہے۔ وقت کا مطلق اور ابدی ہونا بھی مادے کے مطلق اور ابدی ہونے کی طرح ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔

وقت کا ادراک

وقت کا ہمارا ادراک ایک ایسے طریقے پر مشتمل ہے جس میں ہم ایک لمحے کا دوسرے سے تقابل کرتے ہیں۔ ہمارے اس طریقے کی وضاحت مندرجہ ذیل امثال سے ہو جائے گی۔ ایک شخص کی مثال پر غور کریں جو انگلی سے کسی جسم پر چوٹ لگاتا ہے اور ایک خاص آواز سنتا ہے۔ پانچ منٹ کے بعد دوبارہ چوٹ لگاتا ہے اور پھر ایک اور آواز سنتا ہے۔ وہ شخص کہتا ہے اور اسے ادراک ہے کہ پہلی اور دوسری آواز کے درمیان ایک وقفہ موجود ہے۔ وہ شخص اس وقفے کو وقت کا نام دیتا

ہے لیکن جب وہ یہ دوسری آواز سنتا ہے تو اس کے ذہن میں پہلی سنی گئی آواز بذات خود موجود نہیں۔ اس کے ذہن میں صرف یادداشت کا ایک ٹکڑا باقی بچا ہے جو پہلے سنی گئی آواز کی اطلاع کی بازگشت سنوا سکتا ہے۔ یہ شخص لحہ موجود اور یادداشت میں موجود آوازوں کے تقابل سے وقت کا ادراک کرتا ہے۔ اگر یہ تقابل نہ ہو سکے تو وہ اس قسم کا ادراک نہیں کر سکتا۔

اسی طرح کمرے میں بیٹھا ہوا ایک شخص کسی شخص کے کمرے میں داخل ہونے اور کمرے کے وسط میں پڑی کرسی پر بیٹھنے کے عمل کو دیکھتا ہے۔ جس وقت یہ شخص کرسی پر بیٹھ رہا ہوتا ہے تو دیکھنے والے کے ذہن میں اس کے کمرے میں داخل ہونے اور چل کر کرسی کی طرف بڑھنے کے واقعات یادداشت کی صورت محفوظ ہو رہے ہوتے ہیں۔ وہ شخص کرسی پر بیٹھے آدمی اور دروازے میں داخل ہونے کی یادداشت کی معلومات کی بنیاد پر وقت کا تعین کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ وقت اُس وقت وجود میں آتا ہے جب دماغ میں موجود اور ذخیرہ شدہ التباسات کا باہمی تقابل کیا جاتا ہے۔ اگر ایسی یادداشت موجود نہ ہو تو پھر دماغ اس طرح کی تشریحات نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی وقت کا ادراک ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کو اس لیے تیس برس کا محسوس کرتا ہے کہ اس کے ذہن میں گزرے ہوئے تیس سال اطلاعات کی صورت میں جمع ہو گئے ہیں۔ اگر ایسی یادداشت موجود نہ ہو تو وہ گزر گئے لمحات کو پھر سوچ نہیں سکے گا اور یوں وہ صرف اپنی زندگی کے لحہ موجود پر سوچے گا۔

لازمانیت کی سائنسی توضیح

آیئے ہم کوشش کرتے ہیں کہ اس نقطے کی وضاحت کے لئے مختلف سائنسدانوں اور علماء کے بیانات سے استفادہ کریں۔ پیچھے کی طرف بہتے ہوئے وقت کے موضوع پر بات کرتے ہوئے مشہور دانشور اور نوبل انعام یافتہ جینیات کے پروفیسر فرانکوئس جیکب Francois Jacob اپنی کتاب (THE POSSIBLE AND THE ACTUAL) میں لکھتے ہیں:

"پیچھے کی طرف چلتی ہوئی فلم ہمارے لئے ایک ایسی دنیا کو ممکن بنا دیتی ہے جس میں وقت پیچھے کی طرف بہتا ہے۔ اس دنیا میں کپوں میں پڑی کافی سے دودھ علیحدہ ہو کر واپس اپنے برتن میں چلا جاتا ہے۔ اس دنیا میں یہ بھی ممکن ہے کہ روشنی کی شعاعیں دیواروں سے خارج ہوں۔ اس دنیا میں پتھر پانی میں سے نکل کر تیرتا ہوا اوپر اٹھتا ہے اور ڈھلوان راستے پر چلتا ہوا انسان کی ہتھیلی پر

آجاتا ہے۔تاہم ایک ایسی دنیا میں جہاں وقت اس طرح کی الٹی صفات رکھتا ہے ہمارے دماغ کی فصلیت اور یادداشت کے محفوظ ہونے کا عمل بھی اسی الٹی سمت میں چلے گا۔ یہ بات ماضی اور مستقبل کے لئے بھی درست ہے۔اس لئے یہ دنیا، جس میں ہر چیز الٹی چل رہی ہے، ہمارے لئے اسی طرح حقیقی ہوگی جیسی کہ یہ موجودہ دنیا ہے''۔ ہمارا دماغ واقعات کی ایک خاص ترکیب کا عادی ہو چکا ہے۔اس لئے ہم اوپر بیان کی گئی دنیا کا تصور نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہمیں وقت ہمیشہ آگے کی طرف بہتا ہوا نظر آتا ہے۔تاہم اس طرح کا فیصلہ صرف ہمارے دماغ کے اندر ہوتا ہے اور یہ مکمل طور پر اضافی ہے۔درحقیقت ہم اس امر کا ادراک نہیں کر سکتے کہ وقت کس طرح بہتا ہے یا پھر بہتا بھی ہے کہ نہیں۔ یہ بیان کردہ حقیقت اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ وقت اضافی ہے۔ یہ مطلق نہیں ہے اور یہ محض ادراک کی ایک قسم ہے۔

وقت کے اضافی ہونے کی حقیقت کی تصدیق بیسویں صدی کے نامور ماہر طبیعات آئن سٹائن نے بھی کی۔ لنکن بارنیٹ Lincoln Barnet اپنی کتاب The Universe and Dr. Einstein کائنات اور ڈاکٹر آئن سٹائن میں لکھتا ہے:

''مطلق فضا کے ساتھ ساتھ آئن سٹائن نے مطلق وقت کا نظریہ بھی مسترد کر دیا۔آئن سٹائن نے ایک ساکن کائنات میں کسی ایسے مطلق وقت کے وجود سے انکار کیا جو مستقبل سے ماضی کی طرف بہہ رہا ہو۔نظریہ اضافیت پر عمومی طور پر پائے جانے والے ابہام کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان وقت کی ماہیت کو درست طور پر سمجھنے سے ہچکچاتا ہے۔وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ رنگوں کی طرح یہ بھی ایک طرح کا ادراک ہے بالکل اسی طرح جیسے فضا صرف مادی اجسام کی ممکنہ ترتیب ہے۔اسی طرح وقت بھی محض واقعات کی ترکیب کا احساس ہے۔وقت کی موضوعیت کا بہترین بیان خود آئن سٹائن کے اپنے الفاظ میں ہوتا ہے۔وہ کہتا ہے''ہمارے نزدیک کسی شخص کا تجربہ واقعات کا ایک خاص ترتیب میں موجود سلسلہ ہے۔اس سلسلے کا کوئی ایک واقعہ جو ہمیں یاد رہ جاتا ہے۔دوسرے واقعات کے پہلے یا بعد میں وقوع پذیر ہونے کا حوالہ بن جاتا ہے۔اس لئے ایک فرد کے لئے ذاتی یا موضوعی وقت موجود ہوتا ہے۔لیکن یہ وقت بجائے خود قابل پیمائش نہیں تاہم ان واقعات کے ساتھ اس طریقے سے اعداد وابستہ کئے جا سکتے ہیں کہ بعد میں ہونے والے واقعے سے پہلے ہونے والے واقعے کی نسبت کوئی بڑا عدد وابستہ کر دیا جائے''۔

بارنے کی کتاب کے مطابق آئن سٹائن خود کہتا ہے''زمان و مکان صرف وجدانی تشکیلات

ہیں جس طرح ہم رنگ، جسامت اور حجم کے تصورات کو ذہن سے نہیں نکال سکتے اسی طرح ہم زمان و مکان کے اپنے تصورات کو بھی اپنے شعور سے بے دخل نہیں کر سکتے''۔

بار نے لکھتا ہے کہ عمومی نظریۂ اضافیت کے مطابق ''واقعات کی جس خاص ترتیب کو ہم وقت کی پیمائش کے لئے استعمال کرتے ہیں ان سے علیحدہ وقت کا کوئی وجود نہیں''۔

چونکہ وقت صرف ادراکات پر مشتمل ہے اس لئے یہ اضافی ہے اور یہ کلی طور پر ادراک کرنے والے پر منحصر ہے۔

انسانی جسم میں ایسا کوئی کلاک موجود نہیں جو درستگی کے ساتھ وقت کے بہاؤ کی پیمائش کر سکے۔ اس لئے ہم وقت کی پیمائش کے لئے مختلف حوالے استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں وقت کتنی تیزی سے بہتا ہوا محسوس ہوتا ہے اس کا انحصار چنے گئے حوالے پر ہے۔ جب تک وقت کا حوالہ دینے کے لئے کوئی واقعہ موجود نہ ہو تب تک ایک گھنٹہ، ایک دن اور ایک سال کے فرق میں کوئی فرق نہیں۔ وقت کی اضافیت کا ایک اور ثبوت ہمارے خواب ہیں۔ خوابوں میں بعض اوقات ہم کئی گھنٹوں پر مشتمل واقعات دیکھتے ہیں لیکن ان کی لمبائی درحقیقت چند منٹ اور اکثر اوقات چند سیکنڈ سے زیادہ کی نہیں ہوتی۔

آیئے اس موضوع کو مزید واضح کرنے کے لئے ایک اور مثال پر غور کرتے ہیں۔ فرض کریں کہ ہمیں ایک ایسے کمرے میں بند کر دیا گیا ہے جس کی صرف ایک ہی کھڑکی ہے۔ ہمیں اس کمرے میں خاص وقت کے لئے رکھا جاتا ہے۔ کمرے میں ایک کلاک لگا ہوا ہے جس میں ہم گزرنے والا وقت دیکھ سکتے ہیں۔ کمرے کی کھڑکی اس طرح کی ہے کہ ہمیں خاص وقتوں کے بعد طلوع اور غروب ہوتا ہوا سورج بھی نظر آتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ہم کمرے میں گزارے گئے وقت کے متعلق جواب دیں گے تو ہماری معلومات کمرے میں لگے کلاک اور طلوع و غروب کی تعداد پر مشتمل ہوں گی۔ مثال کے طور پر ہم اندازہ لگاتے ہیں کہ ہم نے اس کمرے میں تین دن گزارے۔ تاہم ہمیں کمرے میں بند کرنے والا شخص بتاتا ہے کہ تم نے صرف دو دن گزارے ہیں کیونکہ کمرے میں لگائے ہوئے کلاک کو چلنے میں تیز کر دیا گیا تھا اور طلوع و غروب کے مناظر بھی اصلی نہیں تھے بلکہ انہیں مصنوعی طور پر پیدا کیا گیا تھا۔ اس صورت حال میں وقت کے متعلق ہمارا دعویٰ بے معنی ہو جائے گا۔ اس مثال سے تصدیق ہو جاتی ہے کہ وقت گزرنے کی رفتار پر ہماری معلومات صرف اضافی حوالوں پر مشتمل ہیں۔ وقت کی اضافیت ایک سائنسی حقیقت ہے جسے

سائنسی طرزِ کار سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ آئن سٹائن کا عمومی نظریۂ اضافیت بتاتا ہے کہ وقت اشیاء کی رفتار اور مرکزِ ثقل سے فاصلے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب رفتار بڑھتی ہے تو وقت کے وقفے کھنچ کر چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ رفتار بڑھنے کے ساتھ ساتھ وقت گزرنے کی رفتار سست پڑتی چلی جاتی ہے۔ ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ وقت ٹھہر جاتا ہے۔

آیئے خود آئن سٹائن کی دی ہوئی مثال پر غور کرتے ہیں۔ دو جڑواں بھائیوں پر غور کریں جن میں سے ایک زمین پر ٹھہرتا ہے اور دوسرا روشنی کی رفتار سے کچھ کم پر سفر کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ جب یہ مسافر واپس لوٹتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا بھائی اس کی نسبت کہیں زیادہ عمر رسیدہ ہو چکا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ روشنی کی رفتار کے قریب سفر کرنے والے پر وقت آہستگی سے گزرتا ہے۔ اب فرض کریں کہ ایک باپ جس کی عمر ستائیس برس ہے اپنے تین سالہ بیٹے کو زمین پر چھوڑ کر ایسے ہی ایک سفر پر نکلتا ہے۔ جب زمین کے وقت کے مطابق باپ تیس سال کے بعد واپس لوٹے گا تو بیٹا ۳۳ برس کا ہو چکا ہوگا جبکہ باپ کی عمر صرف تیس برس ہوگی۔ یعنی کہ جس دورانیے میں زمین پر تیس برس گزرے اسی میں خلاؤں کے اس مسافر کے صرف تین برس گزرے''۔

یہاں یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ وقت کی یہ اضافیت کلاک کے آہستہ یا تیز چلنے سے پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا تعلق میکانی سپرنگ کے ڈھیلے ہونے سے ہے بلکہ یہ پورے مادی نظام کے تفرقی فعلی وتفوں کا نتیجہ ہے۔ جب وقت کا وقفہ چھوٹا ہوتا ہے تو دل کی دھڑکن خلیوں کی تقسیم اور دماغی فعلیت بھی عام حالات کے مقابلے میں سست پڑ جاتی ہے۔ یہ شخص زندگی کے معمولات میں حصہ لیتا ہے اور اسے وقت کی اس سست رفتاری کا احساس نہیں ہوتا۔ تقابل کئے بغیر وقت کی اس سست رفتاری کا احساس بھی نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں اضافیت

جدید سائنس کی دریافتوں کی روشنی میں ہم یہ طے کر چکے ہیں کہ فلسفہ مادیت کے مفروضات کے برعکس وقت کوئی مطلق شے نہیں بلکہ صرف ایک اضافی احساس ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ حقیقت جو سائنس پر بیسویں صدی تک منکشف نہ ہوئی تھی قرآن میں چودہ صدی پہلے بیان کر دی گئی تھی۔ قرآن میں کئی مقامات پر وقت کے اضافی ہونے کے حوالے ملتے ہیں۔

قرآن کی کئی آیات میں وقت کے ایک نفسی ادراک ہونے کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

مثال کے طور پر قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ کسی فرد کی پوری زندگی وقت کا بہت ہی چھوٹا سا وقفہ ہے۔

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ٥

''جس روز وہ تمہیں پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اس وقت یہ ہوگا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اس حالت میں پڑے رہے ہیں''۔ (سورۃ بنی اسرائیل:۵۲)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ٥

اور جس دن خدا ان کو جمع کرے گا (تو وہ دنیا کی نسبت ایسا خیال کریں گے کہ) گویا (وہاں) گھڑی بھر دن سے زیادہ رہے ہی نہیں تھے (اور) آپس میں ایک دوسرے کو شناخت بھی کریں گے جن لوگوں نے خدا کے روبرو حاضر ہونے کو جھٹلایا وہ خسارے میں پڑ گئے۔

کچھ اور آیات میں بتایا گیا ہے کہ مختلف افراد وقت کا ادراک علیحدہ علیحدہ طریقے سے کرتے ہیں اور بعض اوقات بہت مختصر سا وقت انسان کو بہت طویل نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر دوسرے جہان میں یوم حساب کے موقع پر لوگوں کی باہمی گفتگو وقت کی اضافیت پر بہت اچھی مثال ہے۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ٥ قَالَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَّوْ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ٥

(خدا) پوچھے گا کہ تم زمین میں کتنے برس رہے، وہ کہیں گے کہ ہم ایک روز یا ایک روز سے بھی کم رہے تھے شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے۔ (خدا) فرمائے گا کہ (وہاں) تم (بہت ہی) کم رہے، کاش تم جانتے ہوتے۔

کچھ اور آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ صورت حال کے بدلنے پر وقت کی رفتار بھی بدل جاتی ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ۔

اور (یہ لوگ) تم سے عذاب کے لئے جلدی کر رہے ہیں اور خدا اپنا وعدہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا، اور بیشک تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کے رو سے ہزار برس

کے برابر ہے۔ (سورۃ الحج:۴۷)

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ط ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِىْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝
ان کی آنکھیں جھک رہی ہوں گی اور ذلت ان پر چھا رہی ہوگی، یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ (سورۃ المعارج:۴۴)

یہ تمام آیات وقت کی اضافیت کے بیان میں ہیں۔ بیسویں صدی کی سائنس کے ثابت کردہ ان حقائق کا چودہ سو سال پہلے بیان ہو جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ نے نازل کیا جو تمام زمان و مکان پر محیط ہے۔

قرآن کی اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وقت سوائے ادراک کے اور کچھ نہیں۔ یہ حقیقت خصوصاً قرآن میں بیان کی گئی حکایات میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر اصحابِ کہف کے واقعے میں اہل ایمان کا ایک گروہ تین سے زیادہ صدیوں تک سوتا رہتا ہے۔ جگائے جانے پر یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ انہیں سوئے ہوئے کچھ پہر ہی ہوئے ہیں۔ وہ لوگ نہیں جان پاتے کہ انہوں نے حالت نیند میں کتنا لمبا عرصہ گزارا۔

فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَىُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝
تو ہم نے غار میں کئی سال تک اُن کے کانوں پر (نیند کا) پردہ ڈالے (یعنی اُن کو سلائے) رکھا۔ پھر ان کو جگا اٹھایا تا کہ معلوم کریں کہ جتنی مدت وہ (غار میں) رہے دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔ (سورۃ کہف:۱۱-۱۲)

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ط قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ط قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ط فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝
اور اسی طرح ہم نے ان کو اٹھایا تا کہ آپس میں ایک دوسرے سے دریافت کریں۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ تم (یہاں) کتنی مدت رہے۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن یا اس سے بھی کم۔ انہوں نے کہا کہ جتنی مدت تم رہے ہو تمہارا پروردگار ہی اس کو خوب جانتا ہے۔ تو اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ دے کر شہر کو بھیجو وہ دیکھے کہ نفیس کھانا کونسا ہے تو اس میں سے کھانا لے آئے اور آہستہ

آئے جائے اور تمہارا حال کسی کو نہ بتائے۔ (سورۃ کہف:١٩)

ذیل میں دی گئی آیت بھی ایسی ہی ایک صورت حال کو بیان کرتی ہے جس میں وقت ایک نفسی ادراک کے طور پر سامنے آتا ہے۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

"یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اس نے کہا: "یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟" اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اس کو دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا: "بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟" اس نے کہا: "ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا"۔ فرمایا: "تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں"۔ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا: "میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ (سورۃ البقرۃ:٢٥٩)

مندرجہ بالا آیت سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وقت کا خالق ہے اور وقت اس پر محیط نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے وقت انسان پر محیط ہے۔ انسان تو یہ بھی نہیں جان سکتا کہ وہ کتنی دیر تک سویا رہا۔ ایسی حالت میں وقت کے مطلق ہونے پر اصرار نہایت غیر معقول حرکت ہے۔

مقدر

وقت کی اضافیت ایک بہت اہم امر کی وضاحت کرتی ہے۔ اضافیت اتنی متغیر ہے کہ وقت

کا وہ وقفہ جو ہمارے لئے کروڑوں سال پر محیط ہے ممکن ہے کہ کسی دوسری جہت میں ایک سیکنڈ سے زیادہ نہ ہو اور عین ممکن ہے کہ دنیا کے وجود میں آنے سے لے کر ختم ہو جانے تک کا کل زمانی وقفہ محض چند سیکنڈوں پر مشتمل ہو۔ یہ تصور ہی دراصل مسئلہ مقدر کی روح ہے۔ بہت سے لوگ ابھی تک اس مسئلہ کی اصل روح کو نہیں سمجھ سکے۔ ان میں سے زیادہ تعداد فلسفہ مادیت کے حامل لوگوں کی ہے۔ مقدر اس امر کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ ماضی اور مستقبل کے تمام واقعات کا مکمل علم رکھتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت سوال کرتی ہے کہ اللہ وہ واقعات کیسے جان سکتا ہے جو ابھی ظہور میں نہیں آئے۔ اپنی اس کم فہمی کے باعث یہ لوگ مقدر کی درست طور پر تفہیم نہیں کر پاتے۔ تاہم واقعات کا ظہور میں نہ آنا صرف ہمارے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ زمان و مکان کا پابند نہیں کیونکہ یہ دونوں اس کی اپنی تخلیق ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کے لئے ماضی، حال اور مستقبل میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے لئے ہر چیز ظہور میں آ چکی ہے اور مکمل ہو چکی ہے۔

لنکن بارنے نے اپنی کتاب THE UNIVERSE AND DOCTOR EINSTEIN میں لکھا کہ عمومی نظریہ اضافیت اس حقیقت کی توضیح کرتا ہے کیونکہ "کائنات کی پوری شان و شوکت پر ایک کونیاتی دانش محیط ہے۔ یہ ارادہ جسے بارنے کونیاتی دانش کا نام دیتا ہے دراصل اللہ تعالیٰ کا علم اور دانش ہے جو اس کل کائنات پر محیط ہے۔ وقت کی لحاتی تقسیم ہمارے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے وقت اپنے آغاز سے انجام تک صرف ایک لمحے کا نام ہے اور وہ اسے ایک لمحے کے طور پر ہی جانتا ہے۔ لوگ واقعات کو اپنی اپنی باری آنے پر دیکھتے ہیں اور لوگ وہی کچھ دیکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقدر میں دیکھنا لکھ دیا ہے۔ معاشرے میں مقدر کا ایک بگڑا ہوا تصور موجود ہے۔ اس تصور کی سطحیت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تصور کچھ یوں ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کا مقدر متعین کر دیا ہے لیکن کچھ لوگ اسے بدلنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر موت کے دروازے سے لوٹ آنے والے شخص کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ "اس نے موت کو شکست دی" لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اپنا مقدر بدلنے پر قادر نہیں۔ وہ شخص جو موت کے دروازے سے لوٹتا ہے محض اس لئے نہیں مرتا کہ ابھی اُسے مرنا نہیں تھا۔ اسی طرح جو لوگ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہوئے کہتے ہیں "میں اپنے مقدر سے شکست کھا گیا" اُن کا مقدر ہی یہ کہنا تھا۔

مقدر دراصل اللہ تعالیٰ کے علم کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ جو وقت کو ایک لمحہ واحد کی طرح جانتا

ہے اور جو تمام زمان ومکان پر حاوی ہے اور جس کے لئے ہر چیز طے شدہ اور مکمل ہے، قرآن میں وقت کی بیان شدہ حقیقت کے باعث ہمیں پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے وقت ایک ہے۔ بعض واقعات جو ہم پر مستقبل میں بیتیں گے انہیں قرآن میں اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا وہ پہلے ہی وقوع پذیر ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک آیت میں لوگوں کا اللہ تعالیٰ کو حساب دینے کا واقعہ اس طرح مذکور ہے گویا وہ واقعہ پہلے ہی پیش آ چکا ہو۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ○

اور جب صور پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب بیہوش ہو کر گر پڑیں گے مگر جس کو خدا چاہے، پھر دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔ (سورۃ زمر: ۶۸)

اور کچھ اور آیات میں بھی ان موضوعات کا بیان ملتا ہے۔

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ○

اور ہر شخص (ہمارے سامنے) آئے گا، ایک (فرشتہ) اس کے ساتھ چلانے والا ہوگا اور ایک (اس کے عملوں کی) گواہی دینے والا۔ (سورۃ ق: ۲۱)

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ○

اور آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس دن کمزور ہوگا۔ (سورۃ الحاقہ: ۱۶)

وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ○ مُّتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْأَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ○

اور ان کے صبر کے بدلے ان کو بہشت (کے باغات) اور ریشم (کے ملبوسات) عطا کرے گا۔ اُن میں وہ تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ وہاں نہ دھوپ (کی حدت) دیکھیں گے نہ سردی کی شدت۔ (سورۃ الدھر: ۱۲-۱۳)

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ○

اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے نکال کر رکھ دی جائے گی۔ (سورۃ النازعات: ۳۶)

وَمَآ أُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ○

حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ (سورۃ المطففین: ۳۳)

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا٥

اور گنہگار لوگ دوزخ کو دیکھیں گے تو یقین کر لیں گے کہ وہ اس میں پڑنے والے ہیں اور اس سے بچنے کا کوئی رستہ نہ پائیں گے۔ (سورۃ الکہف: ۵۳)

جیسا کہ دیکھا جا چکا ہے کہ ہماری موت کے بعد ہونے والے واقعات کو یوں بیان کیا گیا ہے گویا پہلے ہی واقع ہو چکے ہیں۔ ہماری طرح اللہ تعالیٰ وقت کے اضافی فریم کا پابند نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کا ارادہ لازمانیت میں کیا تھا۔ لوگ تمام تر وقوعات میں سے پہلے سے گزر چکے ہیں اور یہ سب واقعات گزارے جا چکنے کے بعد مکمل ہو کر ختم ہو گئے ہیں۔ نیچے کی آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہر لمحہ خواہ وہ لمبا ہو یا مختصر، بڑا ہو یا چھوٹا اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور اس کا اندراج ایک کتاب میں موجود ہے۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ٥

"اے نبی تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سناتے ہو اور لوگو تم بھی جو کچھ کرتے ہو اس سب کے دوران ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے، جو چھوٹی نہ بڑی جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو"۔ (سورۃ یونس: ۶۱)

اہل مادیت کی پریشانی

اس باب میں مادے لازمانیت اور لامکانیت پر جو بحث کی گئی نہایت واضح ہے یہ کوئی ایسی فکر نہیں جو فہم و فراست سے ماوراء ہو۔ سامنے کے یہ حقائق جھٹلائے نہیں جا سکتے۔ تکنیکی طور پر حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ عقل اور منطق کے پیمانوں پر بھی پورے اترتے ہیں۔ ان حقائق کا دوسرا کوئی متبادل موجود نہیں۔ کائنات مکمل طور پر بمعہ اپنے مادے کے اور اس میں بسنے والے انسان کے محض ایک واہمہ اور مجموعہ ادراک ہے۔

مادیت پرستوں کو یہ مسئلہ سمجھنا خاصا مشکل ہے۔ جب کوئی مادہ پرست یہ کہتا ہے "میں نے پتھر کو ٹھوکر ماری اور میرے پاؤں کو چوٹ لگی اس لئے پتھر موجود ہے تو وہ یہ امر نظر انداز کر دیتا ہے

کہ چوٹ کا اثر محض حسی ادراک ہے۔ اس لئے اس کی بیرونی مناسبت یعنی پتھر بھی محض ایک مجموعہ ادراکات ہے۔ مادہ پرست ان حقائق کو اس لئے سمجھ نہیں پاتے کیونکہ انہیں خوف ہے کہ سمجھ لینے کے بعد انہیں اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بار نے اس موضوع پر کچھ سائنسدانوں کے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"فلسفہ دانوں نے معروضی حقیقت کی ادراکات پر مبنی ایک ظلی دنیا میں تحویل کر دی ہے اور سائنسدان بھی حواسِ انسان کے محدود ہونے پر گھبرا اٹھے ہیں"۔

مادہ پرستوں کو جب بھی زمان و مکان کے محض مجموعہ ادراکات ہونے کا علم ہوتا ہے تو وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی فکری بنیادیں ہی ان دو اشیاء کو مطلق ماننے پر قائم ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ بذریعہ ارتقاء اُسے مادے اور وقت نے پیدا کیا۔ دوسرے الفاظ میں وہ مادے اور وقت کو معبود مان کر ان کی پرستش کرتا ہے۔

جب ایک مادہ پرست کو پتہ چلتا ہے کہ اُس کا جسم اردگرد کے سب لوگ غرض یہ کہ ہر چیز محض مجموعہ ادراکات ہے تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جس چیز پر انحصار کر رہا تھا اچانک پاؤں کے نیچے سے سرکنے لگتی ہے۔ اس کی مایوسی اسی طرح کی ہے جیسے یوم حساب کی ذیل میں قرآن پاک میں بیان کی گئی ہے:

وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ٥

اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے اور جو طوفان وہ باندھا کرتے تھے سب ان سے جاتا رہے گا۔ (سورۃ النحل: ۸۷)

اسی لئے مادیت پرست اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ مادہ ایک حقیقت ہے۔ وہ اپنے اس نظریے کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے اپنی مرضی کے دلائل اکٹھے کرتا ہے۔ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ اس حقیقت سے فرار نہیں ہو سکتا۔ یہ مادہ پرست خود کو مادے کی حقانیت پر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے لئے پتھروں کو ٹھوکر مارنے، چیخنے چلانے اور دیواروں سے ٹکرانے جیسی سطحی مثالیں مقرر کرتے ہیں لیکن حقیقت سے فرار نہیں پا سکتے۔

یہ نہ صرف اپنے دماغ سے حقیقت کو محو کر دینا چاہتے ہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی حقیقت سے گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں خدشہ ہے کہ اگر مادے کی درست ماہیت لوگوں کے علم میں آ گئی تو ان کے اپنے ازکاررفتہ فلسفے کی قلعی کھل جائے گی اور سب لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ دنیا کے متعلق

ان کا نقطہ نظر کس درجہ ناقص ہے پھر ان کے پاس اپنے نقطہ نظر کے لئے کوئی بنیاد باقی نہ بچے گی۔

اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے کہ وہ ایمان نہ لانے والوں کی حقیقت سے واقف ہے اور دوسری دنیا میں ان کے اعمال پر شدت سے پوچھ گچھ کی جائے گی۔ یوم حساب انہیں اس طرح مخاطب کیا جائے گا:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝

اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے جس نے خدا پر جھوٹ افترا کیا یا اس کی آیتوں کو جھٹلایا۔ کچھ شک نہیں کہ ظالم لوگ نجات نہیں پائیں گے۔ اور جس دن ہم سب لوگوں کو جمع کریں گے پھر مشرکوں سے پوچھیں گے کہ (آج) وہ تمہارے شریک کہاں ہیں جن کا تمہیں دعویٰ تھا۔ (سورۃ الانعام: ۲۱-۲۲)

اس کے بعد یہ لوگ خود دیکھ لیں گے کہ اپنے مال ومنال اور اولاد کو جسے یہ لوگ حقیقت مانتے تھے اور اسے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے کس طرح غائب ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت اس آیت میں واضح کر دی ہے:

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

دیکھو انہوں نے اپنے اوپر کیسا جھوٹ بولا اور جو کچھ یہ افترا کیا کرتے تھے سب ان سے جاتا رہا۔ (سورۃ الانعام: ۲۴)

پہلے ایمان کی منفعت

جس طرح مادے اور وقت کا محض ادراکات پر مشتمل ہونا مادہ پرستوں کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے اسی طرح اس کا متضاد ہونا اہل ایمان کے لئے باعث ایمان ہے۔ جب اہل ایمان کو پتہ چلتا ہے کہ مادے کی حقیقت کیا ہے تو وہ مسرور ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ حقیقت تمام تر سوالوں کا جواب ہے۔ یہ وہ چابی ہے جس سے تمام راز کھل جاتے ہیں۔ جن سوالوں کو سمجھنا ابھی تک مشکل تھا سب پانی ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ حقائق سمجھ لینے کے بعد موت، جنت، دوزخ، حیات

بعد الموت، متغیر جہات اور اللہ کیا ہے، اللہ سے پہلے کیا تھا، اللہ کو کس نے تخلیق کیا، قبر کی زندگی کتنی طویل ہوگی، جنت اور دوزخ کہاں ہیں اور اس وقت جنت اور دوزخ کی کیا حالت ہے، جیسے اہم سوالوں اور مسئلوں کے جواب مل جائیں گے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ اللہ تعالیٰ نے لا شے سے کائنات کا نظام کس طرح تخلیق کیا اور جب یہ عقدہ حل ہو جائے گا تو پھر ''کب'' اور ''کہاں'' جیسے سوالات بے معنی ہو جائیں گے کیونکہ پھر کوئی زمان اور کوئی مکان باقی نہ رہے گا۔ جب لازمانیت احاطہ ادراک میں آ جائے گی تو یہ بات بھی سمجھ لی جائے گی کہ دوزخ، جنت اور زمین دراصل ایک ہی مقام پر واقع ہیں۔ جب لازمانیت سمجھ لی جائے گی تو یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں رہے گا کہ ہر ایک چیز ایک ہی لمحے میں واقع ہو سکتی ہے۔ نہ تو کسی چیز کا انتظار کرنا پڑے گا اور نہ ہی وقت گزرے گا کیونکہ ہر چیز وقوع پذیر ہو کر ختم ہو چکی ہے۔

اس راز کے کھلنے پر کائنات مومن کے لئے جنت بن جاتی ہے۔ تمام غم واندوہ اور اضطراب غائب ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ کائنات کا حاکم ایک ہی ہے اور وہی طبعی دنیا میں جیسی چاہتا ہے تبدیلی کرتا ہے۔ اور اسے یہ سب کرنے کے لئے سوائے ارادہ کرنے کے اور کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ تب صاحب ایمان کے پاس سوائے اللہ کی طرف رجوع کرنے کے نہ کوئی مسئلہ رہ جاتا ہے اور نہ ہی کوئی پریشانی، پھر وہ اپنے آپ کو ذاتِ الٰہی کے لئے وقف کر دیتا ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○

(وہ وقت یاد کرنے کے لائق ہے) جب عمران کی بیوی نے کہا کہ اے پروردگار جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے میں اس کو تیری نذر کرتی ہوں اسے دنیا کے کاموں سے آزاد رکھوں گی تو (اسے) میری طرف سے قبول فرما تو تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ (سورہ آل عمران: ۳۵)

اس امر کی تفہیم اس دنیا کی سب سے بڑی منفعت ہے۔ اس راز کے کھلتے ہی قرآن میں بیان شدہ ایک اور حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن پاک میں یوں بیان کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ○

اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو خیالات اُس کے دل میں گزرتے ہیں ہم اُن کو

جانتے ہیں، اور ہم اُس کی رگ جان سے بھی اُس سے زیادہ قریب ہیں۔ (سورۃ ق ۱۶)

جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ رگ انسانی جسم کے اندر واقع ہے۔ انسان کے اندرون سے زیادہ کونسی چیز اُس کے قریب ہو سکتی ہے۔ یہ صورتِ حال لازمانیت کے تصور سے بآسانی واضح ہو جاتی ہے۔ اگر اس حقیقت کا ادراک کر لیا جائے تو یہ آیت بھی بہ سہولت سمجھی جا سکتی ہے۔

یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے اور یہ مانا ہوا امر ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے نہ انسان کا کوئی حامی و ناصر ہے اور نہ ہی کوئی رب۔ وہی ایک مطلق ہستی ہے جس سے پناہ مانگی جا سکے، مدد کے لئے درخواست کی جا سکے اور وہی ہستی ہے جو اعمال جزا دیتی ہے۔ ہم جس طرف بھی منہ کریں اللہ کے حضور میں ہوں گے۔

حصّہ چہارم

اِرتقاء کا فریب

نظریۂ ارتقاء دنیا کا ایک ایسا تصور اور ایک ایسا فلسفہ ہے جو زندگی کی ابتداء اور وجود کی وضاحت کے لئے محض اتفاقات کی اصطلاحات میں مفروضے اور تخیلاتی منظر نامے پیش کرتا ہے۔ اس فلسفے اور طرزِ فکر کی بنیادیں قدیم یونانی تہذیب میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

تمام دہریانہ فلسفے جو براہِ راست تخلیق کے منکر ہیں نظریۂ ارتقاء سے چمٹے ہوئے ہیں اور اس کے دفاع کی متواتر کوشش کر رہے ہیں۔ مذہبی لا ادریت کا پرچار کرنے والے تمام دوسرے فلسفے بھی اسی صورت حال کا شکار ہیں۔ پچھلی ڈیڑھ صدی کے دوران نظریہ ارتقاء نے اپنے جواز کے لئے سائنس کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اگرچہ یہ نظریہ پچھلی صدی کے وسط میں ایک نام نہاد سائنسی نظریے کے طور پر پیش کیا گیا لیکن تاحال کسی مبسوط نظامِ دلائل، تجربے یا دریافت سے اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ درحقیقت وہی سائنس جسے اس نظریے کو پیش کرنے والوں نے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہا تھا اس نظریے کی متواتر تردید کر رہی ہے۔

لیبارٹری کے تجربات اور امکانیاتی حساب کتاب جیسے سائنسی طریقہ کار ثابت کر چکے ہیں کہ ایما ئنو ایسڈ جن پر زندگی کی بنیاد ہے از خود وجود میں نہیں آسکتے۔ خلیے کے متعلق یہ مفروضہ پیش کیا گیا کہ یہ زمین کے پیدا ہونے کے فوراً بعد کے سخت، درشت اور شدید موسمی حالات میں از خود وجود میں آگیا تھا، تاحال بیسویں صدی کے نفیس ترین اور جدید ترین آلات سے آراستہ لیبارٹری میں بھی پیدا نہیں کیا جا سکا۔ ارتقاء کے ماننے والوں نے پوری دنیا میں بے شمار کھدائیاں کیں لیکن سرتوڑ کوششوں کے باوجود وہ کوئی ایسا رکاز تلاش نہیں کر سکے جسے جانوروں کی کسی دو انواع کی درمیانی اور عبوری کڑی قرار دیا جا سکے۔

ارتقاء کے لئے شہادتیں اکٹھی کرنے کے عمل میں ماہرین ارتقاء نہ چاہتے ہوئے اور غیر ارادی طور پر ایسے شواہد اکٹھے کر بیٹھے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ارتقاء جیسا عمل ممکن نہیں ہے۔

ارتقاء کا نظریہ اس شکل میں جو آج ہمارے سامنے ہے اور جس کے دفاع کے لئے سب کوششیں کی جا رہی ہیں ایک غیر پیشہ ور ماہر حیاتیات چارلس رابرٹ ڈارون Charles Robert Darwin نے پیش کیا۔ ڈارون نے اپنے نظریات سب سے پہلے ۱۸۵۹ء میں اپنی کتاب The Origin of Species by Means of Natural Selection میں پیش کئے۔ ڈارون نے اپنی کتاب میں دعویٰ کیا کہ تمام جاندار اشیاء کا مبدا اور منبع مشترکہ اور ایک ہی تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ فطری انتخاب کے نتیجے میں مختلف شکلوں کے جانور جنم لیتے گئے وہ جانور جنہوں نے اپنے آپ کو اپنے ماحول کے مطابق ڈھال لیا اور اپنے یہ خصائص اگلی نسل میں منتقل کر دیئے وہ اپنے آباؤ اجداد سے مختلف ہوتے گئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ بجائے خود ایک علیحدہ نوع کی شکل اختیار کر گئے۔ ان ماہرین کا خیال ہے کہ فطری انتخاب کے اس طریقہ کار میں جو نسل سب سے زیادہ ترقی یافتہ وجود میں آئی وہ انسانی نسل ہے۔

اس وقت کے نظریاتی اور سیاسی حلقوں نے ڈارون کے تخیلات پر مبنی نظریات کو فوراً اپنا لیا اور ان کی ترویج شروع کر دی۔ یہ نظریہ اس طرح مقبول ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک سائنسی علم اس درجے تک نہیں پہنچا تھا کہ ڈارون کے پیش کردہ غیر سائنسی نظریات کو جھوٹ ثابت کیا جا سکے۔ اس وقت تک جینیات خورد حیاتیات Microbiology اور حیاتی کیمیا Biochemistry جیسے مضامین وجود میں نہیں آئے تھے۔ اگر یہ نظریات وجود میں آ چکے ہوتے تو خود ڈارون کو علم ہو جاتا کہ اس کا نظریہ بے معنی ہے۔ نوع کی ہیئت طے کرنے والی معلومات جین میں موجود ہوتی ہیں اور فطری انتخاب کے ذریعے جین میں تبدیلیاں لا کر اس طرح کی نئی انواع پیدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ابھی فضا میں ڈارون کی کتاب کی بازگشت باقی تھی کہ ۱۸۶۵ء میں آسٹریا کے ایک ماہر نباتیات جارج مینڈل George Mendel نے قوانین وراثت پیش کئے۔ صدی کے آخر تک اس کے کام پر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ اس کے کام کی اہمیت کو ۱۹۰۰ء کے شروع میں از سر نو محسوس کیا گیا اور اسی وقت جینیات Genetics کے متعلق نظریات پیش کئے جانے لگے۔ ۱۹۵۰ء میں ڈی این اے مالیکیول کے متعلق یہ دریافت ہوا کہ یہ توارثی معلومات کی منتقلی کا ذریعہ ہے۔ اس

دریافت نے نظریۂ ارتقاء کو بحران میں مبتلا کر دیا کیونکہ محض اتفاقات سے ڈی این اے میں موجود بے پناہ معلومات کی وضاحت نہیں کی جاسکتی تھی۔

ان نئی سائنسی دریافتوں کے ساتھ ساتھ نظریۂ ارتقاء پر کیے جانے والے کام نے بھی ثابت کر دیا کہ زندہ اجسام کی انواع کے بمراحل ارتقاء کے شواہد تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ سالوں کی تلاش کے باوجود ایسے جانوروں کا کوئی سراغ نہ ملا جن کے متعلق حتمی طور پر کہا جاسکے کہ یہ کم ترقی یافتہ اور ترقی یافتہ جانوروں کی درمیانی کڑی ہیں۔

اس صورت حال میں چاہئے تو یہ تھا کہ نظریۂ ارتقاء کو کوڑا دان میں پھینک دیا جاتا لیکن ایسا نہ ہوا کیونکہ کچھ حلقے ایسے تھے جو اس نظریے میں متواتر تبدیلی اور ترمیم کے ذریعے اسے سائنسی منظر نامے پر بطور ایک نظریے کے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کوششوں کی معنویت اسی صورت میں ثابت ہوسکتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ اس نظریے کے ساتھ کچھ حلقوں کے غیر سائنسی مفادات بھی وابستہ تھے۔

اس نظریے کو جاری رکھنے پر مصر حلقوں نے کچھ ضروری تبدیلیوں کے بعد اسی نظریے کو نوڈارونیت کے نام سے قائم رکھا۔ اس نئے نظریے کے مطابق جانوروں کی نئی انواع جین میں ہونے والی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں Mutation کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔ ان میں سے بہت سی وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوگئیں صرف وہی بچ پائیں جو اپنے ماحول کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتی تھیں۔ لیکن جب یہ امر بھی ثابت ہوگیا کہ نئے نظریہ کی تجویز کردہ میوٹیشن بھی نئی انواع وجود میں نہیں لاسکتی تو ارتقاء دان اسی نظریے کے نئے ماڈل تلاش کرنے لگے۔ اب انہوں نے Galloping Evolution نامی ماڈل پیش کیا اس ماڈل کی کوئی سائنسی یا عقلی بنیادیں موجود نہیں تھیں۔ اس ماڈل کے مطابق دعویٰ کیا گیا کہ زندہ اشیاء اچانک دوسری انواع میں تقسیم ہو جاتی ہیں اور اس دوران کوئی عبوری نوع وجود میں نہیں آتی۔ درحقیقت اس طرح کا دعویٰ نظریۂ تخلیق کو تسلیم کرنے کے مترادف تھا لیکن ارتقاء دان اس امر کو تسلیم کرنے سے بھاگتے تھے۔ یوں انہوں نے اپنی کم فہمی کو چھپانے کی غیر منطقی کوششیں جاری رکھیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے دعویٰ کیا کہ تاریخ حیات کا پہلا پرندہ بغیر کسی وجہ کے اور اچانک کسی رینگنے والے جانور کے انڈے سے برآمد ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تبدیلی کی وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اُن کا دعویٰ ہے کہ خشکی کے گوشت خور جانور بغیر عبوری تبدیلیوں سے گزرے اچانک دیو قامت وہیل مچھلی میں بدل گئے۔

ارتقاء پسندوں کے یہ تمام دعوے جینیات، حیاتی کیمیا اور حیاتی طبیعات کے اصولوں سے متصادم ہیں اور یہ اتنے ہی غیر سائنسی ہیں جتنا خیالی کہانیوں میں مینڈکوں کا شہزادیوں میں تبدیل ہونا۔ اس ماڈل کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ رکازی آثار میں پائے جانے والے اُس خلا کی تشریح کی جا سکے جو نوڈارونی ماڈل کے مطابق نہیں کی جا سکتی لیکن پرندوں کے ارتقاء کے متعلق رکازی آثار میں جو خلا پایا جاتا ہے اس کی وضاحت کے لئے ایسا دعویٰ کرنا خلافِ عقل ہو گا کہ ایک رینگنے والے جانور کے انڈے سے پہلا پرندہ اچانک نمودار ہوا تھا۔ ایسا امر بجائے خود ارتقاء دانوں کے دعووں کی تردید ہو گا کہ انواع کا ارتقاء اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ جینیاتی نظام میں محفوظ اطلاعات میں کوئی بڑی اور افادی تبدیلی ہو لیکن میوٹیشن جیسی تبدیلی نہ تو جینیاتی اطلاعات میں بہتری لا سکتی اور نہ ہی اس میں اضافہ کر سکتی ہے۔ میوٹیشن فقط جینیاتی اطلاعات میں انتشار پیدا کر سکتی ہے چنانچہ اگر ارتقاء کے نئے توازنی ماڈل کی پیش کردہ کلی میوٹیشن کو مان بھی لیا جائے تو اس کا مطلب کلی تقلید کی بجائے کلی تخریب ہو گا کیونکہ ایسی کوئی جینیاتی تبدیلی جینیاتی اطلاعات میں تکسیر اور تخریب کا سبب بنے گی۔

ارتقاء کا یہ نیا خاکہ محض تخیل کی پیداوار تھا۔ اس واضح خامی کے باوجود ارتقاء دان اس نئے خاکے کو اہمیت دیتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ رکازی آثار ڈارون کے نظریے کی تائید نہیں کرتے۔ ڈارون کا دعویٰ تھا کہ انواع میں بمراحل اور بتدریج تبدیلیاں آئیں۔ اگر ڈارون کا یہ دعویٰ درست ہوتا تو لازماً ایسے رکاز دریافت ہو جاتے جو نصف پرندے اور نصف رینگنے والے جانور کے متعلق ہوتے لیکن باوجود وسیع کھدائیوں کے اور لاکھوں رکاز دریافت کر لینے کے ایسی عبوری اشکال دریافت نہ ہو سکیں۔

ارتقاء دانوں نے رکازی آثار کی صورت میں سامنے آنے والی اپنی اس ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے نظریۂ ارتقاء کا یہ نیا ماڈل پیش کیا۔ چنانچہ یہ ماڈل خود مکتفی ثابت نہ ہو سکتا تھا۔ اسی لئے حقائق سے فرار کی یہ کوشش بھی رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی۔ آج کے ارتقاء دان محسوس کر چکے ہیں کہ آنکھوں، پروں، پھیپھڑوں اور دماغ جیسے پیچیدہ اعضاء بتدریج ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ وہ ان خاص مشکل مقامات پر اپنا نقطۂ نظر ثابت کرنے کے لئے نظریۂ ارتقاء کے اپنے ماڈل میں ایسی تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں جو منطق اور عقل دونوں کے خلاف ہیں۔

کیا رکازی آثار میں نظریہ ارتقاء کی تائید ملتی ہے؟

نظریہ ارتقاء کی رو سے ایک نوع کو دوسری میں بدلنے کے لئے لاکھوں سال پر محیط تدریجی عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس دعوے سے منطقی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس تقلیبی دور میں بننے والی عبوری مخلوق کے آثار موجود ہونا چاہئیں اور چونکہ ہر نوع بتدریج اور ایک لمبے عرصے کے ارتقاء سے وجود میں آئی اس لئے ان عبوری اشکال کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہونی چاہیے۔

اگر ایسی مخلوق حقیقتاً موجود رہی ہوتی تو ہمیں کہیں نہ کہیں ان کی باقیات ملنی چاہئیں تھیں۔ اور اگر یہ انداز فکر واقعی درست ہوتا تو ان عبوری مخلوقات کی تعداد کے آثار اور باقیات کو آج زندہ انواع کے مقابلے میں کہیں زیادہ تعداد میں دستیاب ہونا چاہیے تھا اور دنیا کے ہر حصے میں ان کی باقیات کھدائی سے برآمد ہونی چاہئیں تھیں۔

ڈارون کے وقت سے لے کر ماہرین ارتقاء رکاز کی تلاش میں ہیں لیکن تاحال سوائے مایوسی کے انہیں کچھ دستیاب نہیں ہوا۔ نہ خشکی پر اور نہ سمندر میں انہیں کوئی ایسے رکاز ملے ہیں جنہیں کسی دو انواع کے ارتقائی مراحل کی درمیانی عبوری شکل قرار دیا جاسکے۔

ڈارون خود بھی آگاہ تھا کہ ایسی عبوری شکل موجود نہیں ہے لیکن اُسے بہت زیادہ امید تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ ماہرین ایسے ڈھانچے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس امید کے باوجود اُسے علم تھا کہ اُس کے نظریے کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے اسی لئے وہ اپنی کتاب "The Origin of Species" میں لکھتا ہے:

''اگر یہ سچ ہے کہ انواع بتدریج نسل بعد نسل ارتقاء پذیر ہوئیں تو پھر ہمیں عبوری اشکال کیوں نہیں ملتیں؟ ایسا کیوں ہے کہ انواع بجائے مبہم صورت میں ملنے کے واضح طور پر متعین اشکال میں نظر آتی ہیں۔ اس نظریے کی رو سے بے شمار عبوری مخلوق موجود ہونی چاہیے اور ہمیں ان کے ڈھانچے جابجا قشر ارض میں ملنا چاہئیں لیکن ہمیں یہ عبوری اقسام رکازی آثار میں نظر نہیں آتیں اس مشکل نے ایک لمبے عرصے سے مجھے تذبذب میں ڈال رکھا ہے''۔

ڈارون کی یہ پریشانی بلاوجہ نہ تھی، آج بھی ارتقاء دان اس مسئلے پر پریشان ہیں۔ مشہور برطانوی رکاز دان ڈیرک وی اگیر Derek V Ager اس صورت حال کو یوں بیان کرتا ہے:

''جب ہم رکازی ریکارڈ کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بتدریج ارتقاء کے شواہد میسر نہیں

ارتقاء کے نہایت اہم ثبوت جو مسترد کر دیے گئے

(نیچے) Coelacanth مچھلی کے ۴۱۰ ملین برس پرانے فوسل ارتقاء پسندوں کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ ایک … ثابت کرتی تھی کہ یہ مچھلی پانی سے خشکی پر کس طرح منتقل ہوئی۔ یہ حقیقت کہ اس مچھلی کی ۴۰ سے زیادہ زندہ مثالیں موجود ہیں کہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے دوران اسے کئی بار پکڑا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک ایسی مکمل مچھلی ہے جو آج بھی زندہ ہے۔ (بائیں) ۱۳۵ ملین برس پرانا فوسل جو ARCHAEOPTERYX کا تھا جسے پرندوں کا جدِ امجد بتایا گیا اور جس کے متعلق کہا گیا کہ یہ ڈائنوساروں سے بذریعہ عمل تغیر وجود میں آیا تھا۔ اس فوسل پر کی گئی تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ ایک ناپید پرندہ ہے جو کبھی اُڑتا تھا۔





آتے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گروہ کے ناپید ہونے کے بعد دوسرا گروہ اچانک منظرِ عام پر آیا"۔

رکازی ریکارڈ میں پائے جانے والے اس خلا کے حوالے سے یہ کہہ کر مطمئن نہیں ہوا جا سکتا کہ ابھی تک مناسب تعداد میں رکاز دریافت نہیں ہوئے اور کسی نہ کسی دن ایسے رکاز مل جائیں گے۔ ایک اور رکازدان ٹی نوائل جارج دلیل دیتا ہے کہ:

"رکاز آثار کے ناکافی ہونے پر کسی معذرت خواہانہ رویے کی ضرورت نہیں۔ اب تک ملنے والے ریکارڈ میں یہ خلا باقاعدہ طور پر موجود ہیں"۔

زندگی اچانک اور اسی پیچیدہ شکل میں نمودار ہوئی

جب ہم زمین کے طبقات میں پائے جانے والے رکاز کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ زندہ اجسام اچانک اور بیک وقت نمودار ہوئے۔ زمین کی سب سے پرانی تہہ جس میں زندہ مخلوق کے رکاز ملتے ہیں کیمبرین عہد کی ہے۔ یہ تہہ کوئی پانچ سوتیس سے لے کر پانچ سو بیس ملین سال پرانی ہے۔

کیمبرین عہد میں پائی جانے والی مخلوق اچانک نمودار ہوئی اور اس سے پچھلی تہہ میں ایسے

کوئی آثار نہیں ملتے جنہیں کیمبرین عہد کے جانداروں کا آباؤ اجداد کہا جا سکے۔ اس عہد میں ملنے والے جانداروں کی انواع اتنی زیادہ ہیں اور یہ متنوع مخلوق اتنی پیچیدہ ہے کہ ان کے ظہور میں آنے کو کیمبرین فشار کا نام دیا جاتا ہے۔

زمین کے اس طبق سے ملنے والے جاندار آنکھ، پر اور دورانِ خون جیسے پیچیدہ اور ترقی یافتہ نظاموں سے آراستہ ہیں۔ رکازی آثار میں ایسے کوئی شواہد نہیں ملتے کہ ان مخلوقات کے کوئی آباؤ اجداد بھی موجود رہے ہوں گے۔ مشہور رسالے Earth Science کا ایڈیٹر Richard Monestarsky زندہ اشیاء کے اس طرح اچانک نمودار ہونے پر لکھتا ہے:

''نصف بلین سال پہلے ہمیں آج نظر آنے والے کافی پیچیدہ جانور نمودار ہو چکے تھے۔ کوئی پانچ سو پانچ ملین سال پہلے جب زمین کیمبرین عہد میں داخل ہوئی تو ایک ارتقائی دھماکہ ہوا اور تمام سمندر پہلی پیچیدہ مخلوق سے بھر گئے۔ آج کے جانوروں کی بیشتر انواع کے کیمبرین عہد میں بھی موجود ہونے کے شواہد ملتے ہیں اور یہ اس وقت بھی ایک دوسرے سے اتنے ہی ممیز اور متشخص تھے جتنے یہ آج نظر آتے ہیں''۔

ارتقاء پسندوں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ زمین اچانک مختلف انواع کے جانوروں سے کس طرح بھر گئی۔ وہ اس سوال کا جواب دینے کے لئے کیمبرین عہد سے بیس ملین سال پہلے ایک فرضی عہد کا موجود ہونا فرض کر لیتے ہیں جس میں زندگی کے یکا یک بمع اپنے تنوع کے وجود میں آنے کا واقعہ رونما ہوا۔ اس عہد کو یہ ماہرین ارتقائی خلیج کا نام دیتے ہیں۔ لیکن ایسے کسی عہد کے موجود ہونے کی کوئی شہادت نہیں ملتی اور ان کا یہ فرضی عہد آج تک قیاس آرائی کی دھند میں لپٹا ہوا ہے۔

۱۹۸۴ء میں چین کے جنوب مغربی صوبے چنگ جیان میں پیچیدہ غیر فقری جانوروں کے کچھ رکاز برآمد ہوئے۔ ان میں سے کچھ جانور آج ناپید ہو چکے ہیں لیکن دریافت ہونے والے جانور بھی آج کے جانوروں کے مقابلے میں کچھ کم پیچیدہ نہیں ہیں۔

سویڈن کا ماہر ارتقاء سٹیفن بینگسٹن (Stephen Bengston) اس صورتِ حال کو واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''اگر تاریخ حیات میں تخلیق انسان جتنا پراسرار واقعہ کوئی موجود ہے تو وہ یہی بحری حیات اچانک متنوع ہو جانے کا عمل ہے جس میں سمندری حیات کی ماحولیات اور ارتقاء میں کثیر خلوی

جانوروں کو غلبہ حاصل ہوا۔ اس امر نے ڈارون کو بھی گھبراہٹ میں ڈال دیا تھا اور یہ امر ہمارے لئے بھی پیچیدگی پیدا کر رہا ہے"۔

پیچیدہ زندہ اجسام کا بغیر کسی آباؤ اجداد کے اچانک ظہور میں آ جانا جس قدر ڈارون کے لئے ایک سو پینتیس سال پہلے حیران کن تھا اسی طرح آج کے ماہرین کے لئے بھی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ صدی بعد بھی ڈارون کا پیش کردہ یہ نظریہ اپنے ابتدائی مفروضوں سے ایک قدم آگے نہیں چل سکا۔

رکاز کے آثار سے ثابت ہو چکا ہے کہ زندہ اشیاء میں اس طرح کا کوئی ارتقاء نہیں ہوا کہ انہوں نے سادہ سے پیچیدہ کی طرف سفر کیا ہو بلکہ وہ ایسی اور مکمل شکل میں پیدا ہوئی تھیں۔ عبوری اشکال اور ماہیت کا عدم وجود صرف کیمبرین عہد کی خصوصیت نہیں بلکہ کسی بھی ارتقائی ترقی کا ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جو یہ بتا سکے کہ جب یہ خاص نوع اس خاص نوع میں بدلی تو درمیان میں یہ خاص عبوری شکل اختیار کر گئی۔

بالفاظ دیگر تمام جاندار پیدا کئے گئے نہ کہ یہ بذریعہ ارتقاء وجود میں آئے۔



بائیں: لال بیگ کا ۳۲۰ ملین برس پرانا فوسل۔

نیچے: سہ تختہ دار بحری جانور (Trilobite) کا ۳۶۰ ملین برس پرانا فوسل۔



خاکوں میں فریب دہی

نظریۂ ارتقاء کے ثبوت دریافت کرنے کی کوشش کرنے والے زیادہ تر رکازی آثار پر انحصار کرتے ہوئے اگر بغیر تعصب کے بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ رکازی آثار نظریۂ ارتقاء کی تائید نہیں کرتے بلکہ اُسے مسترد کرتے ہیں۔ لیکن ارتقاء دان رکاز کی من چاہی اور موضوعی تشریح کرتے ہوئے عام لوگوں کے سامنے یہ تاثر دیتے ہیں کہ گویا رکازی آثار نظریۂ ارتقاء کے شواہد ہیں۔ جو کچھ رکاز کے سلسلے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات کو تمام رکاز آثار پر اس طرح منطبق کرتے ہیں کہ ان کا دعویٰ درست ثابت ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمین کھود کر جو رکاز نکالے جاتے ہیں ان کی تسلی بخش شناخت نہیں ہو پاتی۔ عام طور پر یہ رکاز بکھری ہوئی ہڈیوں کے نامکمل ٹکڑوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے دستیاب اعداد وشمار کی من چاہی تعبیر ممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حیرت کی بات نہیں کہ ان رکاز کو سامنے رکھ کر ماہرین ارتقاء قیاس پر مبنی جو خاکے بناتے ہیں ارتقاء کی حمایت میں ہوتے ہیں۔ چونکہ لوگوں کو پہلے ہی سے متاثر کیا جا چکا ہوتا ہے، وہ ان خیالی خاکوں کو دیکھ کر یقین کرنے لگتے ہیں کہ ایسے جاندار ماضی میں واقعی موجود رہے ہوں گے۔

ہڈیوں کی باقیات کے مطالعے پر مبنی یہ خاکے اُن جانداروں کی صرف عمومی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ حقیقی فرق صرف نرم بافتوں میں موجود ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ غائب





مسلسل نصف بن مانس نصف انسان نما تصاویر دیکھ دیکھ کر عوام الناس ان کے حقیقی ہونے کے قائل ہونے لگے۔ تاہم تصاویر صریحاً جعلسازی پر مشتمل ہیں۔

ہو چکی ہوتی ہیں۔ نرم بافتوں کے غائب ہو جانے کے بعد موجود ہڈیوں پر کوئی بھی شخص اپنے تخیل کے مطابق قیاس آرائی پر مبنی شکل تیار کر سکتا ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کا (Ernest A.Hutton) ارنسٹ اے ہٹن اس صورت حال کی اس طرح وضاحت کرتا ہے:

"نرم حصوں کی تعمیر زیادہ مشکل کام ہے۔ ہونٹ، آنکھیں، کان اور ناک کے متعلق ہڈیوں سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ آپ ایک نینڈرتھل کھوپڑی پر یکساں سہولت کے ساتھ ایک بندر اور ایک فلاسفر کا چہرہ تعمیر کر سکتے ہیں۔ انسانوں کی اس طرح کی قدیم اور ابتدائی اقسام کے موجود ہونے کے نظریات کی سائنسی وقعت، اگر کوئی ہے تو، بہت کم ہے۔ ایسے نظریات عوام الناس کی گمراہی کا باعث ہیں۔ اس لئے باقیات سے قیاس آرائی پر مبنی مکمل حیوانات تعمیر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے"۔

پلٹ ڈاؤن مین (Piltdown Man)

۱۹۱۲ء میں ایک انگریز معالج اور شوقیہ رکاز دان چارلس ڈاسن نے اعلان کیا کہ اسے پلٹ ڈاؤن (Piltdown) کے قریب ایک گڑھے سے ایک قدیم کھوپڑی اور جبڑا ملا ہے۔ اگرچہ کھوپڑی انسان کی سی تھی لیکن جبڑے کی ساخت بندر کے زیادہ قریب تھی۔ ان کے متعلق بتایا گیا کہ دونوں پانچ لاکھ سال قدیم ہیں۔ جس شخص کی یہ کھوپڑی تھی، اسے پلٹ ڈاؤن مین (Piltdown Man) کا نام دیا گیا۔ چالیس سے زیادہ سال تک اس انسان پر تحقیقات جاری رہیں جس کی یہ کھوپڑی تھی۔ اس پر کئی مقالے تحریر کئے گئے۔ اس کھوپڑی کی بنیاد پر پلٹ ڈاؤن مین اور اس کے اہل خانہ کی تصاویر بنائی گئیں۔ اس کھوپڑی کو نظریۂ ارتقاء کے فیصلہ کن ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا۔



پلٹ ڈاؤن کھوپڑی

۱۹۴۹ء میں سائنس دانوں نے اس کھوپڑی کا دوبارہ جائزہ لیا اور نتیجہ اخذ کیا کہ اس کی دریافت کا دعویٰ کرنے والے نے جان بوجھ کر فریب کاری سے کام لیتے ہوئے انسانی کھوپڑی کے ساتھ Orangutan کا جبڑا ملا دیا ہے۔

فلورین تابکاری کا طریقہ استعمال کرتے

ہوئے محققین نے دریافت کیا کہ کھوپڑی چند ہزار سال سے زیادہ پرانی نہیں۔ بندر کی ایک نسل سے تعلق رکھنے والے جبڑے کے دانتوں کو مصنوعی طریقے سے گھسایا گیا اور اس کے قریب پائے گئے پتھر کے اوزار بھی دراصل لوہے کے اوزاروں سے تراشے گئے تھے۔ بعد میں ایک بار پھر ۱۹۵۳ء میں تجزیہ کیا گیا اور یہ فریب کاری عوام کے سامنے آئی۔ کھوپڑی دراصل پانچ سو سال پرانے انسان کی تھی اور یہ جبڑا بعد میں اس کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ پھر ان سب ٹکڑوں کو پوٹاشیم ڈائی کرومیٹ میں ڈبویا گیا تھا تاکہ پرانی ہڈی کا خاص رنگ واضح ہو جائے۔ جب اس ہڈی کو تیزاب میں ڈبویا گیا تو اس کے اصل دھبے غائب ہو گئے۔ تحقیقاتی ٹیم کا ایک رکن لے گراس کلارک اپنی حیرت نہ چھپا سکا وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

''مصنوعی گھسائی فوراً نظر آ گئی۔ یہ اتنی واضح تھی کہ ایک طویل عرصے تک اس کا آنکھوں سے اوجھل رہنا بجائے خود حیران کن تھا''۔

نبراسکا مین (Nebraska Man)

۱۹۲۲ء میں ہینری فیر فیلڈ نے اعلان کیا کہ اسے مغربی نبراسکا میں سنیک برک کے قریب ایک داڑھ ملی ہے۔ ہینری فیلڈ امریکہ کے نیچرل ہسٹری میوزیم کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ اس دانت میں انسانی اور بندر کے دانت دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس پر ایک طویل بحث کا آغاز ہو گیا۔ کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ اس کا تعلق ابتداء میں پائے جانے والے ایک انسان Pilhecan Thropus Erctus سے ہے جبکہ کچھ اسے جدید انسان سے زیادہ قریب مانتے تھے۔ تاہم اسی جھگڑے میں اس متنازع انسان کو نبراسکا مین کا نام دیا گیا۔ جلد ہی اس کو اس کا سائنسی نام Hesperopithecus Haroldcooki بھی دے دیا گیا۔

بہت سے ماہرین نے فیر فیلڈ کے نظریے کی حمایت کی۔ اس اکیلے دانت کی بنیاد پر نبراسکا مین کا پورا چہرہ اور جسم بنا دیا گیا۔ اور تو اور اس کے پورے خاندان کی خیالی تصویریں کھینچی گئیں۔

۱۹۲۷ء میں اس ڈھانچے کا باقی حصہ بھی دریافت کر لیا گیا۔ نئے دریافت شدہ ٹکڑوں کے مطابق کی گئی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ دانت نہ انسان کا تھا اور نہ ہی بندر کا۔ ماہرین بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ دانت امریکہ میں بسنے والے ایک ایسے سور کی نسل سے تعلق رکھتا ہے جو ایک عرصہ ہوا معدوم ہو چکی تھی۔



دی گئی تصویر صرف ایک دانت کو بنیاد بنا کر کھینچی گئی اور یہ الیوسٹریٹڈ لندن نیوز کے ۲۴ جولائی ۱۹۹۳ء کے شمارے میں شامل تھی۔ تاہم ماہرین ارتقاء کو اس وقت بے اندازہ مایوسی ہوئی جب انہیں پتہ چلا کہ دانت نہ بن مانس نما جانور کا تھا اور نہ ہی انسان کا بلکہ سور کی نسل کے ایسے جانور کا تھا جو ناپید ہو چکا ہے۔

کیا انسان اور بندروں کے آباؤ اجداد ایک ہی ہیں؟

نظریۂ ارتقاء کے دعوے کے مطابق جدید انسان اور بندر ایک ہی آباؤ اجداد کی اولاد ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس آباؤ اجداد کی اولاد کا ایک حصہ ارتقاء پذیر ہو کر آج کا انسان بن گیا اور دوسرا حصہ آج کا بن مانس۔

نظریۂ ارتقاء کے ماہرین نے انسان اور بن مانس کے اس فرضی آباؤ اجداد کو Australopithecus کا نام دیا جس کا مطلب ہے ساؤتھ افریقہ کا بن مانس۔ جہاں تک اس مبینہ بندر کا تعلق ہے تو یہ بن مانس کی ایک ایسی نسل ہے جو اب معدوم ہو چکی ہے۔ اس سے ملتی جلتی انواع اور ذیلی انواع اب بھی پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ مضبوط اور جسیم جبکہ کچھ چھوٹے اور منحنی ہیں۔

ارتقاء دانوں نے انسانی ارتقاء کے اگلے مرحلے کو Homo کا نام دیا جس کا مطلب ہے انسان۔ ارتقاء دانوں کے مطابق ہوموسلسلے کے جاندار Australopithecus کے مقابلے میں نسبتاً ترقی یافتہ ہیں لیکن یہ موجودہ جدید انسان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ ان ماہرین کا خیال ہے کہ آج کا انسان یعنی Homo Sapien ارتقاء کے سب سے آخری مرحلے پر وجود میں آیا۔

معاملے کی حقیقت یہ ہے کہ ماہرین ارتقاء کے وضع کردہ اس فرضی منظر نامے میں

Australopithecus محض ایک بن مانس ہے جو معدوم ہو چکا ہے۔ جبکہ جن انسانوں کو وہ Homo سلسلے کی مختلف کڑیاں قرار دیتے ہیں دراصل وہ ماضی میں بسنے والے انسان تھے جو معدوم ہو گئے۔

ارتقاء دانوں نے بندروں اور انسانوں کے مختلف ملنے والے رکازکو جسامت کے اعتبار سے بڑی سے چھوٹی ترتیب دیا اور اسے انسانی ارتقاء کے اپنے منصوبے میں من چاہے طریقے سے استعمال کیا۔ تاہم سائنسی حقائق بیان کر چکے ہیں کہ ان رکاز سے کسی طرح بھی ارتقاء کی شہادت نہیں ملتی۔ ان رکاز میں سے کچھ حقیقی بندروں کے ہیں اور کچھ حقیقی انسانوں کے۔ کوئی فرق اگر موجود ہے تو وہ محض جسامت کا ہے اس کے علاوہ کوئی حقیقی فرق موجود ہونے کے شواہد نہیں ملتے۔

آسٹریلوپیتھی کس: معدوم بندر (Australopithecus: Extinct Apes)

ارتقاء دانوں کا دعویٰ ہے کہ آسٹریلوپیتھی کس جدید انسان کے قدیم آباؤ اجداد ہیں۔ اس قدیم مخلوق کی کھوپڑی اگرچہ جدید بن مانس سے ملتی جلتی ہے لیکن اس کے مغز کا خانہ نسبتاً چھوٹا ہے۔ ارتقاء دان کہتے ہیں کہ یہ جاندار دو پاؤں پر چلتا تھا اس لئے اسے جدید انسان کا آباؤ اجداد تصور کیا جا سکتا ہے۔

انسان اور بندر کی حرکات قطعی مختلف ہیں۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے جو دو پاؤں پر آزادی سے چل سکتی ہے۔ اس طرح کی محدود سی صلاحیت کچھ اور جانوروں میں بھی ملتی ہے لیکن بنیادی طور پر ان کا ڈھانچہ خمیدہ چال کے لئے ہے۔

ماہرین ارتقاء کے مطابق آسٹریلوپیتھی کس کی چال آج کے انسان کی طرح سیدھی تھی۔ انہوں نے اس کی نسبتاً سیدھی دو پاؤں پر چال کو بنیاد بناتے ہوئے اسے موجودہ انسان کا آباؤ اجداد قرار دے دیا۔

آسٹریلوپیتھی کس کے دو پاؤں پر چلنے کی صلاحیت سے انکار بھی سب سے پہلے ارتقاء پسندوں کی طرف سے سامنے آیا۔ ان ڈھانچوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد قرار دیا گیا کہ آسٹریلوپیتھی کس انسان کی نسبت بندر کے زیادہ قریب تھا۔

۱۹۷۰ء میں چارلس ای آکسنرڈ (Charles E.Oxanerd) نے تفصیلی مطالعے کے

بعد اعلان کیا کہ اس کا ڈھانچہ آج کے اورینگوٹان (Orang-utan) سے متشابہ ہے۔

جس دریافت نے ارتقاء دانوں کو واقعی مایوس کیا وہ یہ تھی کہ آسٹریلوپیتھی کس جھکے ہوئے انداز میں بھی دو پاؤں پر نہیں چل سکتا تھا۔ نئی حیاتی طبیعات سے ثابت ہوا کہ آسٹریلوپیتھی کس کو اس طرح چلنے کے لئے بے پناہ توانائی خرچ کرنا پڑتی ہے اس لئے اس کا دو پاؤں پر جھک کر چلنا خارج از امکان ہے۔ ۱۹۹۶ء میں ایک انگریز ماہر حیاتیات رابن کرامپٹن نے کمپیوٹر پر بنائے جانے والے خاکوں سے ثابت کیا کہ اس طرح کی مرکب چال ممکن نہیں۔ حیوانات یا تو بالکل سیدھا چلتے ہیں یا پھر چاروں ہاتھوں پاؤں پر۔ چلنے کے ان دو طریقوں کے بین بین کوئی طریقہ لمبے عرصے کے لئے اختیار کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح توانائی کا بے پناہ ضیاع ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ آسٹریلوپیتھی کس نہ تو جھک کر چلتا تھا اور نہ ہی دو پاؤں پر۔

آسٹریلوپیتھی کس کے دو پاؤں پر نہ چلنے کی سب سے مضبوط شہادت ۱۹۹۴ء میں ایک ماہر علم الابدان فریڈ سپور (FRDE SPOOR) نے پیش کی جو انگلینڈ میں University of Liverpool کے Department of Human Anatomy and Cellular Biology کا چیئرمین ہے۔

اس گروپ نے رکازی حالت اختیار کر جانے والے جانداروں کے دو پایہ ہونے پر تحقیقات کیں۔ ان کی تحقیق کان کے اندر پائے جانے والے ایک آلے کے گرد گھومتی تھی جو دو پایہ چال کو متوازن رکھنے کا کام کرتا ہے۔ انہوں نے فیصلہ کن طور پر ثابت کر دیا کہ آسٹریلوپیتھی کس دو پایہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے نتیجے سے اس حیوان کے انسان کی طرح کے ہونے کی تردید ہوگئی۔

ہومو سیریز: اصل انسان (Homo Series)

خیالی انسانی ارتقاء کی اگلی منزل ہومو یعنی کہ انسانی سلسلے ہیں۔ یہ مخلوق دراصل انسان ہی تھی اور کسی بھی طرح آج کے جدید انسان سے مختلف نہیں تھی۔ بس اتنا فرق تھا کہ یہ انسان مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ارتقاء دانوں نے ان کی جسمانی ساخت میں پائے جانے والے بہت تھوڑے فرق کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور انہیں مختلف نسلوں کی بجائے علیحدہ علیحدہ انواع قرار دیا۔ تاہم جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس ہومو سیریز سے تعلق رکھنے والے انسان ہمارے ہی جیسے تھے۔

ارتقاء دانوں کے تخیل پر مبنی منظر نامے کے مطابق انسانی انواع میں ہونے والے ارتقاء کے مطابق ہومو کو ان ذیلی انواع میں بانٹا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے Homo Erectus اس کے بعد دوسرے نمبر پر Homo Sapien Archaic اور Nanderthal Man۔ ان کے بعد Cro Magnan Man اور سب سے آخر میں جدید انسان کی باری آتی ہے۔

ارتقاء دانوں کے دعووں کے برعکس ان کی گنوائی ہوئی تمام انواع دراصل انسان ہی ہیں۔ آیئے سب سے پہلے ہوموار یکٹس کا جائزہ لیتے ہیں جسے ارتقاء دان انسانی انواع میں سے قدیم ترین گردانتے ہیں۔

ہوموار یکٹس Homo Erectus کے قدیم نوع نہ ہونے کا سب سے واضح ثبوت ترکانہ بوائے Turkana Boy ہے۔ ماہرین کے نزدیک ہوموار یکٹس کی باقیات میں سے یہ قدیم ترین ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بارہ سالہ یہ لڑکا ۱.۸۳ میٹر لمبا ہوگا۔ اس رکاز کا کھڑا ڈھانچہ آج کے انسان سے کسی طور مختلف نہیں۔ یہ رکاز اس امر کی اہم ترین شہادت ہے کہ ہوموار یکٹس بھی دراصل آج کی انسانی نسل ہی تھی۔ ارتقاء دان رچرڈ لی کے (Leakey) ہوموار یکٹس اور جدید انسان کا تقابل کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مشاہدہ کرنے والا کھوپڑی کی شباہت، چہرے کے ابھار کا زاویہ اور بھنوؤں کی ہڈی کا ابھار دیکھے گا۔ ان میں سے کوئی بھی چیز ڈرامائی طور پر جدید انسان سے الگ نہیں۔ اگر کوئی فرق ہے بھی تو وہ فقط اتنا ہے جتنا آج کے انسان کی مختلف نسلوں کے مابین پایا جاتا ہے۔ جب کسی آبادی کو لمبے عرصے تک جغرافیائی طور پر الگ رکھا جائے تو اس قسم کے فرق معمولات ہو جاتے ہیں''۔

لی کے کا مطلب یہ ہے کہ ہوموار یکٹس آج کے انسان سے محض اتنا مختلف ہے جتنا آج کا نیگرو آج کے اسکیمو سے۔ کھوپڑی کا یہ فرق، دودھ پلانے کے طریقے اور دوسری انسانی نسلوں سے لمبے عرصے تک کٹے رہنے کے نتیجے میں بھی نمودار ہو سکتا ہے۔

ہوموار یکٹس کی ایک علیحدہ نوع نہ ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس دریافت ہونے والے رکاز میں سے کچھ ستائیس ہزار اور کچھ تیرہ ہزار سال پرانے ہیں۔ اوّل الذکر جزیرہ جاوا میں دریافت ہوئے جبکہ موخر الذکر آسٹریلیا کے علاقے Kow میں ملے۔ ان رکاز سے پتہ چلتا ہے کہ ہوموار یکٹس بھی ہمارے ماضی قریب تک زندہ تھے لیکن وہ بہر حال ہماری ہی طرح

کے انسان تھے نہ کہ ہم سے الگ مختلف طرح کی کوئی ذیلی نوع۔ بس اتنا ہے کہ کسی وجہ سے وہ نسل ختم ہوگئی۔

آرکیک ہوموسیپین اور نینڈرتھل آدمی

Archaic Homo Sapien and Nanderthal Man

خیالی ارتقائی خاکے میں جدید انسان سے فوراً پہلے آرکیک ہوموکا نمبر آتا ہے۔ جدید انسان اور آرکیک ہوموں میں اتنا کم فرق ہے کہ ماہرین اسے بہت کم الفاظ میں بیان کر کے گزر جاتے ہیں۔ کچھ محققین کے خیال میں اس نسل کے نمائندے آج بھی آسٹریلیا کے اصل باشندوں کی صورت میں موجود ہیں۔ آرکیک ہوموسیپین کی طرح آسٹریلیا کے ان باشندوں کی بھنوئیں بھی ابھری ہوئی اور کھوپڑی کا سائز نسبتاً چھوٹا ہے۔ کچھ اور تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی حالیہ زمانے تک ایسے کچھ انسان ہنگری اور اٹلی کے کچھ دیہات میں بھی پائے جاتے تھے۔

ارتقاء دانوں نے ہالینڈ کی نینڈر وادی سے ملنے والے ڈھانچوں کو نینڈرتھل آدمی قرار دیا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جدید انسانوں میں بھی ان کی نسل موجود ہے۔ ہونے والی دریافتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ راگ رنگ کے شوقین تھے اور اپنے مردے دفناتے تھے۔

درحقیقت نینڈرتھل نسل کو بعض معاملات میں جدید انسانوں پر فوقیت حاصل تھی نہ صرف ان کی کھوپڑی کا حجم زیادہ تھا بلکہ ان کا جسم بھی زیادہ مضبوط اور قد کاٹھ نسبتاً بڑا تھا۔ ایک ماہر علم الابدان ٹرنکاس (Trinkaus) کے خیال میں نینڈرتھل کے دھڑ اور ٹانگوں کی ہڈیاں جدید انسان کے مقابلے میں زیادہ مضبوط تھیں۔ ان کی دریافت ہونے والی ہڈیوں سے پتہ چلتا ہے کہ جدید انسان ایسی طاقت شاید کبھی حاصل نہ کر سکے۔ ان کے بچوں اور خواتین میں بھی جسمانی طاقت کا یہی عالم تھا''۔

مختصراً یہ کہ نینڈرتھل انسان (Nanderthal Man) بھی انسان ہی کی ایک نسل تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ دوسرے انسانوں میں ضم ہوگئی۔

ان تمام عوامل سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی ارتقاء کا منظرنامہ خود ارتقاء پسندوں کے تخیل کی پیداوار ہے اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ انسان ہمیشہ سے انسان تھا اور بندر شروع سے ہی ایک الگ نوع تھے اور آج بھی ہیں۔

کیا زندگی کے حادثاتاً وجود میں آنے کا ارتقائی نظریہ درست ہے؟

نظریۂ ارتقاء کی رو سے زندگی کا آغاز ایک خلیے سے ہوا۔ یہ خلیہ ابتدا میں زمین پر موجود سخت طبعی حالات کے باعث وجود میں آیا۔ اس دعویٰ کی صداقت جانچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم خلیے کی ساخت کا جائزہ لیں۔ ہم اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکے ہیں لیکن آج بھی خلیے کی ساخت اور فعلیت کے بہت سے پہلو ہمارے لئے راز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک خلیے میں ذرائع ابلاغ، نقل و حمل اور انتظام کے اتنے پیچیدہ نظام موجود ہیں کہ یہ کسی بہت بڑے شہر سے کم منظم نہیں۔ توانائی پیدا کرنے کے لئے اس کے اپنے نظام موجود ہیں۔ ہارمون اور خامرے پیدا کرنے کے لئے اس کی اپنی فیکٹریاں ہیں۔ پھر اس کے اندر مختلف اشیاء کی پیداوار کے متعلق معلومات ذخیرہ کرنے کا ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔ اس کے ایک حصے سے دوسرے تک خام مال اور تیار مال کی نقل و حمل کے لئے مکمل پائپ لائن موجود ہے۔ خام مال کو توڑنے اور اسے قابل استعمال بنانے کے لئے جدید ترین اور ترقی یافتہ ترین ریفائنریاں بھی اس کے اندر موجود ہیں۔ خلیے کے اندر داخل ہونے اور نکلنے والے مادے پر کنٹرول اور اس کے حساب کتاب کا ایک بے خطا نظام کسی بھی انسانی نظام سے کم تر نہیں۔ یہ سب اس ناقابل یقین حد تک پیچیدہ نظام کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔

خلیہ اپنی ساخت میں اتنا پیچیدہ ہے کہ زمین پر پائے جانے والے ابتدائی حالات کا تو ذکر ہی کیا ہم اپنی جدید ترین تجربہ گاہوں میں بھی خلیہ تیار نہیں کر سکتے۔ پورا خلیہ تو ایک طرف رہا ہم اس کا کوئی حصہ مثلاً مائٹو کانڈریا یا رائبوسوم بھی مصنوعی طور پر نہیں بنا سکتے۔ پہلے خلیے کا ازخود اور حادثاتی طور پر بن جانا سوائے بے بنیاد تخیل کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

پروٹین کا توافق کو چیلنج Protein Challenge Coincidence

صرف اتنا نہیں کہ ہم خلیہ نہیں بنا سکتے۔ فطری حالات میں خلیے کا لاکھواں، کروڑواں حصہ یعنی پروٹین کا ایک مالیکیول بھی ازخود نہیں بن سکتا۔ پروٹین بہت بڑے بڑے مالیکیولوں پر مشتمل ہے۔ کئی ایک امائنو ایسڈ خاص ترتیب اور تعداد میں مل کر پروٹین کا ایک مالیکیول بناتے ہیں۔ سادہ ترین پروٹین مالیکیول ۵۰ امائنو ایسڈز پر مشتمل ہوتا ہے۔ کچھ پروٹین مالیکیول ایسے بھی ہیں

جو ہزاروں امائنوایسڈز سے مل کر بنتے ہیں۔ کسی ایک امائنوایسڈ کی بیشی یا تبدیلی کے نتیجے میں بننے والا پروٹین مالیکیول اپنے مطلوبہ افعال سرانجام نہیں دے سکے گا اور مالیکیولوں کا ایک بیکار ڈھیر بن کر رہ جائے گا۔

نظریہ امکان کے سادہ سے حساب کتاب سے پتہ چل جائے گا کہ پروٹین کی فعلی ساخت حادثاتی طور پر یا اتفاقاً حاصل نہیں کی جا سکتی۔

امائنوایسڈ کی بیس مختلف قسمیں ہیں۔ فرض کریں کہ اوسط حجم کا ایک مالیکیول ۲۸۸ امائنوایسڈز سے مل کر بنا ہے اس مالیکیول میں ۲۴ امائنوایسڈ ۳۰۰ ۱۰ مختلف طریقوں سے ترتیب پا سکتے ہیں۔ ان تمام ممکنہ ترتیبوں میں صرف ایک ایسی ہے جو مطلوبہ خصوصیات کا مالیکیول پیدا کر سکتی ہے۔ باقی تمام ترتیبیں امائنوایسڈ کے ایسے مجموعے ہیں جو یا تو بالکل بیکار ہیں یا پھر حیاتیاتی نظام کے لئے سخت نقصان دہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ایک پروٹین مالیکیول کے اپنے طور پر بن جانے کے امکانات ۳۰۰ ۱۰ میں سے صرف ایک ہے۔ عملی طور پر دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ مالیکیول کے اپنے آپ بن جانے کے امکانات صفر ہیں۔ مزید یہ ہے کہ ۲۸۸ امائنوایسڈز پر مشتمل مالیکیول ایک درمیانے حجم کا پروٹین مالیکیول ہے۔ پروٹین کے بعد مالیکیول ہزاروں امائنو ایسڈز پر مشتمل ہیں۔ اگر اوپر کا کلیہ استعمال کیا جائے تو ان کا اپنے آپ بن جانا ناممکن ہے۔

اگر کسی ایک پروٹین مالیکیول کا اپنے آپ بن جانا ناممکن ہے تو پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ان جیسے ایک ملین پروٹین مالیکیول باہم بامقصد طور پر مل کر ازخود ایک خلیہ بنا دیں۔ مزید یہ کہ خلیہ صرف پروٹینوں کا ڈھیر نہیں اس میں نیوکلیک ایسڈ، نشاستہ، چکنائی اور برگ پاشیدوں کی طرح کے ایسے بہت سے کیمیائی مادے اور بھی موجود ہیں۔ ان کی ایک خاص نسبت اور آہنگ ہے جس کا انحصار ان کی فعلی ساخت پر ہے۔ ان میں سے ہر ایک خلیے کے کسی فعل کے ساتھ منسلک ہے۔

مختصر یہ کہ خلیے سے قطع نظر اس کے لاکھوں پروٹین مالیکیولوں میں سے کسی ایک کا ازخود بن جانا بھی بعید از فہم ہے۔

ترکی میں ارتقاء دانوں کے سرخیل ڈاکٹر علی ڈیمر سائے ہیں۔ انہوں نے توافقی عمل میں زندگی کے لئے ناگزیر ایک خامرے سائٹوکروم کے بننے پر بحث کی ہے۔ وہ اپنی کتاب Inheritance and Evolution میں لکھتے ہیں:

''سائٹوکروم سی Cytochrome-C کے ترتیب پا جانے کا امکان صفر ہے۔ یعنی کہ اگر

زندگی کے لئے مالیکیولوں کی یہ خاص ترتیب ضروری ہے تو کائنات میں اس کے وجود میں آ جانے کا امکان صفر ہے۔ بصورت دیگر ہمیں اس کی تشکیل میں کسی مابعد الطبیعاتی طاقت کی مداخلت کا اعتراف کرنا پڑے گا لیکن یہ عمل سائنسی مقاصد کے لئے مناسب نہ ہو گا۔ اس لئے ہمیں پہلے مفروضے پر از سر نو غور کرنا ہو گا''۔

ان سطور کے بعد ڈیمر سائے تسلیم کرتا ہے کہ اگرچہ امکانی عمل کو مان لینا غیر حقیقی ہو گا اس کے باوجود وہ اسے سائنسی مقاصد کے پیش نظر ماننے پر مجبور ہے۔

''ایمائنو ایسڈ کا ایک خاص ترتیب میں مل کر سائٹو کروم سی بنانے کا امکان اتنا ہی کم ہے جتنا کہ ایک بندر کا ٹائپ رائٹر پر الل ٹپ انگلیاں مار کر انسانی تاریخ لکھنا''۔

پروٹین بنانے کے لئے صرف اتنا کافی نہیں کہ کچھ خاص ایمائنو ایسڈ ایک خاص ترتیب میں مل جائیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف اقسام کے یہ ایمائنو ایسڈ جو مل کر پروٹین کا مالیکیول بنا رہے ہیں لازمی طور پر چپ دستی (Left Handed) ہوں۔ کیمیائی اعتبار سے ایمائنو ایسڈ کی دو اقسام ہیں۔ چپ دستی اور راست دستی یعنی Left Handed اور Right Handed۔ ان دونوں کی کیمیائی ترکیب ایک سی ہوتی ہے۔ لیکن تمام پروٹینوں میں جو ایمائنو ایسڈ پائے جاتے ہیں سب کے سب چپ دستی ہوتے ہیں۔ اگر ایک راست دستی ایمائنو ایسڈ بھی پروٹین مالیکیول میں داخل ہو جائے تو یہ پروٹین مالیکیول نہ صرف بیکار ہو جاتا ہے بلکہ یہ خلیے کے لئے مہلک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

ہم ایک لمحے کے لئے فرض کرتے ہیں کہ ارتقاء پسندوں کا یہ دعویٰ درست ہے کہ زندگی اتفاقاً وجود میں آئی۔ اس صورت میں چپ دستی اور راست دستی ایمائنو ایسڈ کو برابر تعداد میں پروٹین میں موجود ہونا چاہئے تھا کیونکہ ایمائنو ایسڈ کی ان دونوں اقسام کو وجود میں آنے کے یکساں امکانی مواقع میسر آئے۔ ابھی تک یہ سوال لاینحل ہے کہ پروٹین کس طرح صرف چپ دستی ایمائنو ایسڈ کا انتخاب کرتی ہے اور کوئی بھی راست دستی مالیکیول اس میں موجود نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ ماہرین ارتقاء کے لئے اور تخلیق کے مخالفین کے لئے ابھی تک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ Britanica Science Encyclopaedia جو ارتقاء کا بہت بڑا حامی ہے لکھتا ہے کہ پروٹین مالیکیول میں صرف چپ دستی ایمائنو ایسڈ پائے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ایک سکہ لاکھوں بار اچھالا جائے اور ہر بار ہیڈ کا حصہ اوپر آئے۔ اسی انسائیکلو پیڈیا میں درج ہے کہ ابھی تک یہ سمجھنا ممکن نہیں کہ مالیکیولوں کے انتخاب میں راست دستی یا چپ دستی کا خیال رکھا گیا۔ یقیناً اس انتخاب کا زمین پر

۵۰۰ ایمائنو ایسڈز پر مشتمل ایک اوسط حجم کے مالیکیول کے متشکل ہونے کا امکان، جس میں ایمائنو ایسڈ نہ صرف درست ترتیب میں ہوں بلکہ یہ سب چپ دستی بھی ہوں اور ان کا درمیانی بندھن پیپٹائڈ ہو، 10^{950} میں سے صرف ایک ہے۔ اس عدد کو لکھنے کے لئے '۱' کے بعد ۹۵۰ صفر درکار ہوں گے۔

10^{950} =

100.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.
000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000.000

زندگی کے آغاز سے گہرا تعلق ہے۔

صرف یہی کافی نہیں کہ ایمائنو ایسڈ درست تعداد، ترتیب اور مطلوبہ سہ العبادی حالت میں ترتیب پائیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ یہ ایمائنو ایسڈ اپنے اگلے اور پچھلے ایمائنو ایسڈ سے مخصوص بندھن کے ذریعے جڑا ہوا ہو۔ اس مخصوص بندھن کو پیپٹائیڈ بانڈ Peptide Bond کہتے ہیں اگرچہ ایمائنو ایسڈ ایک دوسرے کے ساتھ اور طرح کے بانڈ بھی بنا سکتے ہیں لیکن جب یہ پروٹین میں باہم منسلک ہوتے ہیں تو ان کے درمیان صرف پیپٹائیڈ بانڈ ہی موجود ہوتا ہے۔

تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ اگر ایمائنو ایسڈ پروٹینی ساخت سے باہر آزادانہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ بانڈ بنائیں تو پیپٹائیڈ بانڈ بننے کا امکان صرف ۵۰% ہوتا ہے۔ چنانچہ ایمائنو ایسڈ سے پروٹین مالیکیول بننے کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ صرف چپ دستی ایمائنو ایسڈ منتخب کیے جائیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تمام مالیکیول آپس میں صرف پیپٹائیڈ بانڈ ہی بنائیں۔ بظاہر ایسا کوئی نظام موجود نہیں جو صرف چپ دستی ایمائنو ایسڈ کو پروٹین میں شامل ہونے دے یا اس امر کو یقینی بنائے کہ تمام ایمائنو ایسڈ آپس میں پیپٹائڈ بانڈ بنا رہے ہیں۔

ان حالات میں ۵۰۰ ایمائنو ایسڈز پر مشتمل ایک پروٹین مالیکیول کے اس طرح وجود میں

آنے کا امکان کہ تمام امینو ایسڈ نہ صرف چپ دستی ہوں بلکہ وہ آپس میں پیپٹائڈ بانڈ (Peptide Bond) سے بھی جڑے ہوں اس طرح نکالی جا سکتی ہے۔

درست ترتیب میں ہونے کا امکان = $1/۲۰^{۵۰۰} = 1/۱۰^{۶۵۰}$

امینو ایسڈز کے صرف چپ دستی ہونے کا امکان = $1/۲^{۵۰۰} = 1/۱۰^{۱۵۰}$

امینو ایسڈز کے مابین صرف پیپٹائڈ بانڈ موجود ہونے کا امکان = $1/۲^{۴۹۹} = 1/۱۰^{۱۵۰}$

کل امکان = $1/۱۰^{۹۵۰}$

اس کا مطلب یہ ہے کہ ۵۰۰ امینو ایسڈز پر مشتمل اوسط حجم کا ایک پروٹین مالیکیول از خود بننے کا امکان $۱۰^{۹۵۰}$ امکانات میں سے صرف ایک ہے۔ یہ وہ امکان ہے جو کاغذ پر نکالا گیا ہے۔ عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس طرح کا کوئی امکان صفر ہے۔ ریاضی میں جب کسی واقعے کے ہونے کا امکان $۱۰^{۵۰}$ میں سے ایک ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ اس واقعے کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ۵۰۰ امینو ایسڈز پر مشتمل پروٹین مالیکیول کا بننا کس درجے بعید از امکان ہے ہمیں دوسرے اور زیادہ خارج از امکان واقعات کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ہیموگلوبن مالیکیول بھی پروٹین پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے ایک مالیکیول میں ۵۷۴ امینو ایسڈ ہوتے ہیں۔ ہمارے خون میں سرخ جسیموں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ ان میں ہر سرخ جسیمہ ۲۸۰ ملین ہیموگلوبن مالیکیولوں سے مل کر بنتا ہے۔ ایک حساب کے مطابق اگر پوری تعداد میں امینو ایسڈ مہیا کر دیے جائیں اور اتنا عرصہ انتظار کیا جائے جتنی زمین کی عمر ہے اور اس سارے عرصے میں یہ امینو ایسڈ ایک دوسرے کے ساتھ کیمیائی بندھن بناتے رہیں تو از خود پروٹین مالیکیول بننے کا امکان صفر ہے۔ جب ایک مالیکیول کی حالت یہ ہے تو پورے سرخ جسیمے کے بننے پر قیاس کرنا مشکل نہیں۔ صرف ایک پروٹین مالیکیول کے از خود وجود میں آنے کے مسئلے پر ارتقاء کا سارا نظریہ منہدم ہو جاتا ہے۔

زندگی کی تخلیق پر جوابات کی تلاش

ارتقاء پسندوں کو پتہ چل گیا تھا کہ حادثاً زندگی کے وجود میں آنے کے نظریے کی راہ میں کٹھن رکاوٹیں حائل ہیں۔ ان کے لئے اپنے عقائد کی عقلی تشریح مشکل ہو رہی تھی چنانچہ انہوں

نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حالات اتنے بھی ناساز گار نہیں کچھ تجربات کا سہارا لیا۔

بے جان مادے سے زندگی کے ظہور کا مسئلہ حل کرنے کے لئے کئی تجربات کئے گئے۔ ان میں سے مشہور ترین ملر کا تجربہ ہے۔ یہ تجربہ ۱۹۵۳ء میں امریکی محقق سٹینلے ملر نے کیا۔

اس نے ایک ٹیوب میں کچھ گیسیں ملا کر اپنی طرف سے ایک ایسا کرۂ ہوائی تشکیل دیا جو اس کے خیال میں زمین پر ابتدا میں موجود تھا۔ کرۂ ہوائی کی یہ ترکیب بھی بعد ازاں غلط ثابت ہوئی۔ اس نے ٹیوب میں ایمونیا، میتھین، ہائیڈروجن اور آبی بخارات ملائے تھے۔

ملر جانتا تھا کہ قدرتی حالات میں میتھین، ایمونیا، ہائیڈروجن اور آبی بخارات باہم عمل نہیں کریں گے۔ اس نے تجویز کیا کہ ابتدا میں زمین پر ہر وقت بارش ہوتی رہتی تھی اور بجلی چمکتی رہتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی گیس کے آمیزے میں سے بجلی کے شرارے گزارنے کا بندوبست کیا۔

ملر نے اپنے اس آمیزے کو ایک ہفتہ تک ۱۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ پر رکھا اور اس میں سے برقی شرارے گزارتا رہا۔ ہفتے کے آخر پر ملر نے آمیزے کا تجزیہ کیا۔ اس آمیزے میں بیس میں سے تین ایمائنو ایسڈ موجود تھے۔

اس تجربے نے ماہرین ارتقاء کے مابین خاصا جوش و خروش پیدا کیا۔ اس کامیابی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ ماہرین ارتقاء نے اسے اپنے نظریے کی کامیابی خیال کرتے ہوئے نئے منظر نامے ترتیب دیئے۔ ان کے خیال میں ملر نے ثابت کر دیا تھا کہ ایمائنو ایسڈ از خود پیدا ہو سکتے ہیں۔ ماہرین ارتقاء نے قرار دیا کہ جب ایک بار ایمائنو ایسڈ بن گئے تو انہوں نے از خود اپنے آپ کو درست انداز میں ترتیب دے کر پروٹین بنا لئے پھر ان میں سے کچھ پروٹین مالیکیول اس طرح ملے کہ خلوی جھلی بن گئی اور پھر کسی نہ کسی طرح ابتدائی اور پہلا خلیہ بھی وجود میں آ گیا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان خلیوں نے مل کر کثیر خلوی جاندار بنائے۔ انہوں نے اپنے تمام تر منظر نامے کی بنیاد ملر کے تجربے پر استوار کی۔

تاہم وقت کے ساتھ ساتھ یہ ثابت ہو گیا کہ ملر کا تجربہ نہ صرف تکنیکی بلکہ نتائج اخذ کرنے کے اعتبار سے بھی سائنسی خطوط پر استوار نہ تھا۔

ملر کے تجربے کا ابطال

ملر کے تجربے کو تقریباً نصف صدی گزر چکی ہے اور اسے ماہرین ارتقاء اب تک غیر جاندار

مادے سے جاندار اشیاء بننے کے ثبوت کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ لیکن اگر ملر کے تجربے کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ صورتِ حال اتنی خوش کن نہیں جتنا ماہرین ارتقاء اسے خیال کرتے ہیں۔ خود ملر کا ارادہ یہ ثابت کرنے کا تھا کہ امائنو ایسڈز زمین کے ابتدائی اور شروع کے حالات میں از خود پیدا ہوئے تھے۔ لیکن تجربے کے نتیجے میں جو چند امائنو ایسڈ پیدا ہوئے وہ بھی کئی طرح سے اس کے مطلوبہ مقاصد کے ساتھ متصادم تھے۔

ملر نے کولڈ ٹریپ (Cold Trap) نامی طریقہ استعمال کرتے ہوئے پیدا ہونے والے امائنو ایسڈ اپنی بنائی ہوئی فضا سے علیحدہ کر لئے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اس ماحول میں یہ امائنو ایسڈ بنتے ہی تباہ ہو جاتے۔ یہ فرض کرنا کہ اس وقت کے زمینی حالات میں آزاد آکسیجن کی کثرت تھی اور لازمی طور پر بالا بنفشی شعاعیں موجود تھیں بے بنیاد ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی ایسے شعوری طریقہ کار کا وجود کس منطق پر تسلیم کیا جائے گا جو امائنو ایسڈ کو بنتے ہی اس ماحول سے نکال لیتا تھا تاکہ وہ تباہ نہ ہو جائے۔

ملر نے جو فرضی کرۂ ہوائی تشکیل دیا غیر حقیقی تھا۔ ملر نے اس میں نائیٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی بجائے میتھین اور امونیا شامل کیے۔

کیوں؟ ارتقاء پسند اس امر پر کیوں اصرار کرتے ہیں کہ پرانے دور میں کرۂ ہوائی لازمی طور پر میتھین، امونیا اور آبی بخارات پر مشتمل تھا۔ اس کا جواب بہت سادہ ہے۔ امونیا کے بغیر امائنو ایسڈ کی تالیف کرنا ناممکن تھا۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کیوین میکین Kevin Mckean رسالہ DISCOVER میں چھپنے والے اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہے:

"ملر اور یورے (Miller and Urey) نے اپنے تجربے میں زمین پر موجود اس دور کے کرۂ ہوائی اور موسمی حالات کا چربہ تیار کیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے میتھین اور امونیا کا آمیزہ تیار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ زمین اس وقت برف، دھات اور پتھر کا متجانس آمیزہ تھی۔ لیکن تازہ ترین تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ اس دور کی زمین بہت گرم تھی اور پگھلے ہوئے لوہے اور نکل پر مشتمل تھی۔ اس لئے اس دور کا کرۂ ہوائی نائیٹروجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آبی بخارات پر مشتمل ہونا چاہیے تھا لیکن نامیاتی مالیکیولوں کے وجود میں آنے کے لئے یہ ماحول کچھ اتنا سازگار نہ تھا"۔

لمبے عرصے کی خاموشی کے بعد خود ملر (Miller) نے تسلیم کیا کہ اس کی تیار کردہ کرۂ ہوائی

کی نقل جو اس نے تجربے میں استعمال کی کچھ اتنی حقیقت پسندانہ نہ تھی۔

ملر (Miller) کے اخذ کردہ نتائج میں ایک اور خامی یہ تھی کہ زمین کے اس دور کے کرۂ ہوائی میں اتنی آکسیجن بہر حال موجود تھی کہ بننے والے ایمائنو ایسڈ موجود نہیں رہ سکتے تھے اور ان کا وجود انتہائی مختصر عرصے کے لیے موجود رہتا۔ آکسیجن کا یہ ارتکاز یقیناً ایمائنو ایسڈ بننے کی راہ میں رکاوٹ ڈال دیتا۔ یہ صورت حال ملر کے تجربے کی مکمل طور پر نفی کرتی ہے۔ کیونکہ اس نے آکسیجن کے کردار کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ اگر اس نے اپنے تجربے میں آکسیجن استعمال کی ہوتی تو میتھین یقیناً کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں بٹ گئی ہوتی اور ایمونیا بھی نائٹروجن اور پانی میں تبدیلی ہوگئی ہوتی۔

اور پھر اس وقت اوزون کی تہہ بھی موجود نہیں تھی۔ ان حالات میں بالا بنفشی شعاعیں بے روک ٹوک زمین تک آ رہی تھیں اس لیے کسی قسم کے نامیاتی مالیکیول کا مستحکم رہنا خارج از امکان تھا۔

ملر کے تجربے میں جہاں کچھ ایمائنو ایسڈز بنے، جو زندگی کے لیے ضروری ہیں وہاں کچھ ایسے نامیاتی تیزاب بھی وجود میں آئے جو زندگی کی فعلیت اور اس کی ساخت کے لیے تباہ کن ہیں۔ اگر ملر نے بننے والے ایمائنو ایسڈز کو فوراً باقی آمیزے سے الگ نہ کر لیا ہوتا تو یہ بننے والے تیزاب کے ساتھ مل کر تباہ ہو جاتے۔ علاوہ ازیں بہت سے راست دستی ایمائنو ایسڈ بھی وجود میں آئے۔ ان ایمائنو ایسڈز کی موجودگی بجائے خود اس امر کی شاہد ہے کہ اگر یہ کسی پروٹین میں شامل ہو جاتے تو نہ صرف حیاتیاتی اعتبار سے معاون پروٹین وجود میں نہ آتیں بلکہ یہ اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے۔

مختصر یہ کہ ملر نے اپنے تجربے کے لیے جن حالات کی نقل کی وہ زندگی کے وجود میں آنے اور موجود رہنے کے لیے موزوں نہیں تھے۔ درحقیقت اس کا یہ آمیزہ تیزابی محلول بن گیا اور اگر اس میں کوئی مفید مالیکیول موجود رہ جاتے تو بذریعہ تکسیر فوراً اپنے اجزائے ترکیبی میں بٹ جاتے۔

ارتقاء دانوں نے اس تجربے کو اپنے دعویٰ کی بنیاد بنا کر خود اپنے نظریے کی تردید کر دی۔ اس تجربے سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ تجربہ گاہ میں ایمائنو ایسڈ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتے جب تک ان کے لئے مناسب ماحول شعوری کوشش سے مہیا نہ کیا جائے یعنی کہ شعوری مداخلت کے بغیر تجربہ گاہ میں بھی ایمائنو ایسڈ پیدا نہیں کیے جا سکتے۔

اس تجربے سے ثابت ہوا کہ زندگی کسی بے شعور حادثے کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئی بلکہ اسے کوئی شعور پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ دوسرے الفاظ میں زندگی حادثہ نہیں بلکہ ایک تخلیق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کا ہر عمل ہمیں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کی گواہی مہیا کر رہا ہے۔

معجزاتی مالیکیول ڈی این اے (DNA)

نظریۂ ارتقاء ایک مالیکیول کے وجود میں آنے کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ مالیکیول خلیے کی بنیاد ہیں۔ جینیات کی سائنس میں ہونے والی ترقی اور DNA اور RNA کی دریافت نے نظریۂ ارتقاء کے لئے نئی قسم کے مسائل سامنے لا کھڑے کیے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں دو سائنسدانوں جیمز واٹسن اور فرانسس کرک نے DNA پر کام کیا اور حیاتیات کی دنیا ایک نئے عہد میں داخل ہوئی۔ بہت سے سائنس دانوں نے اپنی تحقیق کا رخ جینیات کی طرف موڑا۔ آج سالوں کی تحقیقات کے نتیجے میں DNA کی ساخت انسان پر کافی حد تک کھل چکی ہے۔ یہاں ہم DNA کی ساخت اور فعلیات کا ایک مختصر اور ابتدائی جائزہ پیش کریں گے۔

ہمارے جسم میں تقریباً سو ٹریلین خلیے موجود ہیں۔ ان میں سے ہر خلیے میں DNA مالیکیول پایا جاتا ہے۔ ہر DNA مالیکیول میں پورے انسانی جسم کا ساختی منصوبہ تمام تر تفصیلات کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ ایک خصوصی اشاراتی نظام کے ذریعے بیرونی خلیے سے لے کر اندرونی اعضاء کی بناوٹ تک ہر چیز اس ایک مالیکیول میں درج کی گئی ہوتی ہے۔ DNA پر یہ معلومات چار بنیادی اکائیوں کی مخصوص ترتیب کے ذریعے درج کی جاتی ہے۔ ان اکائیوں کو G, T, A اور C کہتے ہیں۔ یہ حروف ان اکائیوں کے انگریزی ناموں کے پہلے حرف ہیں۔ مختلف انسانوں میں جو ساختی فرق پایا جاتا ہے وہ ان حروف کی ساختی ترتیب کے فرق کا نتیجہ ہے۔ ایک DNA مالیکیول میں تقریباً ۳.۵ بلین حروف کی عبارت موجود ہوتی ہے۔

کسی شخص میں کسی خاص عضو کی ساخت یا ایک خاص صلاحیت DNA کے جس حصے پر درج ہوتی ہے اسے جین کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر آنکھوں کی ساخت کے متعلق تمام معلومات جین کے ایک خاص سلسلے میں موجود ہوتی ہے جبکہ دل کے متعلق معلومات ایک اور جینیاتی سلسلے میں پائی جاتی ہیں۔ ایک خلیے میں پیدا ہونے والی پروٹین جین پر موجود ہدایات کے مطابق تیار کی جاتی ہے۔ پروٹین تیار کرنے کے لئے ایمائنو ایسڈ کے انتخاب اور ان کی درست ترتیب کا کام DNA

کی تین ساختی اکائیوں کے سپرد ہے۔

یہاں پر ایک اہم نقطہ پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر ساختی اکائیوں میں کوئی بے ترتیبی ہو جائے تو جنم دینے لینے والی جین قطعی بیکار ہو گی۔ یہ امر طے ہو چکا ہے کہ انسانی جسم میں دو لاکھ جین موجود ہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اتنی کثیر تعداد میں جین بنیادی ساخت کی اکائیوں کے حادثاً ملنے پر وجود میں آ جائیں۔ اس عمل کے ناممکن ہونے کو ایک ارتقائی حیاتیات دان فرینک سیلسبری نے یوں بیان کیا ہے:

"درمیانے درجے کا ایک پروٹین مالیکیول ۳۰۰ امائنو ایسڈز پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی ساخت متعین کرنے والی DNA میں ایک ہزار ساختی اکائیاں ہوتی ہیں۔ DNA میں چار قسم کی ساختی اکائیاں موجود ہیں۔ اور ہر ساختی اکائی کے ایک ہزار بندھن ہوتے ہیں اس لئے یہ چار ساختی اکائیاں ۴۱۰۰۰ مختلف طریقوں سے جڑ سکتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ساختی اکائیاں مل کر ۱۰۶۰۰ مختلف قسم کے سلسلے بنا سکتی ہیں۔ اتنا بڑا عدد ہمارے احاطۂ ادراک سے باہر ہے"۔

ارتقاء دان پروفیسر علی ڈیمر سائے اس مسئلے پر اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ:

"درحقیقت DNA اور RNA کے اپنے طور پر وجود میں آنے کے امکانات ناقابل قیاس حد تک کم ہیں"۔

ان ناممکنات کے علاوہ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ DNA اپنے دوہرے بل دار ڈھانچے کی وجہ سے کسی طرح بھی کیمیائی تعامل میں حصہ نہیں لیتا۔ اس لئے اس کی زندگی کی بنیاد ہونے کے امکانات اور بھی کم ہو جاتے ہیں۔

DNA اپنی نقل صرف کچھ خامروں کی موجودگی میں تیار کر سکتا ہے۔ یہ خامرے بھی دراصل کیمیائی ساخت کے اعتبار سے پروٹین ہیں۔ ان کی تیاری کا طریقہ بھی DNA پر درج ہے۔ چنانچہ یہ خامرے اور DNA اپنے وجود کے لئے ایک دوسرے کے مرہون منت ہیں۔ یہ بیک وقت موجود ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی غیر موجودگی میں اپنے طور پر وجود میں نہیں آ سکتا اور اگر ایسا ہونا لازم ہے تو ان میں سے کسی ایک کو پہلے تخلیق کرنا پڑے گا۔ امریکی خورد حیاتیات دان جیکب سن اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"نئے اعضاء کی تخلیق، توانائی کی پیدائش اور اعضاء سے اس اخراج، بڑھوتری کی ترتیب اور ہدایات کے دیئے جانے اور ان کے عمل میں آنے کے لئے ضروری ہے کہ متعلقہ تمام اعضاء

ایک ہی وقت میں وجود میں آئیں اور اپنا کام شروع کر دیں۔ ان وقوعات کی ہم زمانیت کی توجیح کرنے کے لئے خدائی مداخلت کی طرف بار بار دھیان اٹھتا ہے"۔

اوپر کا یہ اقتباس ایک ایسی تحریر سے لیا گیا جو DNA کی ساخت دریافت ہونے کے دو سال بعد لکھی گئی۔ تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود یہ مسئلہ تا حال ارتقاء دانوں کے لئے لاینحل ہے۔ مختصر یہ کہ افزائش نسل کے لئے DNA کی ضرورت، کسی پروٹین کی ضرورت اور DNA پر درج ہدایات کے مطابق نئی پروٹین کے پیدا ہونے کی ضرورت نے ارتقاء دانوں کا نظریہ منہدم کر دیا ہے۔

دو جرمن سائنسدانوں Junker اور Scherer نے وضاحت کی ہے کہ:

"ابھی تک ہمارے علم میں ایسا کوئی تجربہ نہیں آیا جس میں کیمیائی ارتقاء کے لئے ضروری تمام مالیکیول حاصل کر لئے گئے ہوں۔ اس لئے یہ لازم ہے کہ مختلف مالیکیول علیحدہ علیحدہ جگہ پر تیار کئے جائیں اور پھر انہیں کسی ایک جگہ جمع کر دیا جائے لیکن تب بھی انہیں ضیائی اثرات سے بچانا ضروری ہوگا"۔

مختصر یہ کہ نظریہ ارتقاء مالیکیول کی سطح پر بھی ارتقائی مراحل کی وضاحت نہیں کر سکا نہ تو ایمائنو ایسڈز اور نہ ہی خلیے کا ساختی مادہ یعنی کہ پروٹین نام نہاد، قدیم زمینی حالات میں پیدا ہو سکتا تھا اور پھر پروٹین کی پیچیدہ ساخت ان کی چپ دستی اور راست دستی کی خصوصیات پیپٹائڈ بندھن کی مشکلات اس پر مستزاد ہیں۔ مستقبل میں بھی یہ مرکبات تجربہ گاہ میں تیار نہیں کئے جا سکیں گے۔ اور بہت سی وجوہات کے علاوہ اس کی راہ میں مذکورہ بالا مشکلات بھی حائل ہیں۔ اگر ہم ایک لمحے کو فرض کر لیں کہ یہ ایمائنو ایسڈز اور پروٹین حادثاً اور ہم زمانی طور پر وجود میں آ گئے تھے تو بھی بجائے خود اس عمل کے کوئی معنی نہیں نکلتے۔ پروٹین بجائے خود کوئی چیز نہیں یا اپنے آپ کو از خود پیدا نہیں کر سکتی۔ پروٹین کے پیدا ہونے کے لئے DNA اور RNA پر موجود معلومات اور ان پر عملدرآمد کی ضرورت ہوتی ہے۔ DNA اور RNA کے بغیر کوئی پروٹین اپنے آپ کی نقل پیدا نہیں کر سکتی۔ جسم میں موجود پروٹین کی بیس مختلف ایمائنو ایسڈ اکائیوں کو ترتیب دینے کے لئے DNA پر درج شدہ ہدایات کی ضرورت ہوگی لیکن جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ DNA اور RNA اپنے آپ کو تخلیق نہیں کر سکتے۔

تخلیق کی حقیقت

ہر میدان میں نظریۂ ارتقاء کی ناکامی کے بعد خورد حیاتیات کے نامور محققین تخلیق کی حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ انہوں نے یہ ماننا شروع کر دیا ہے کہ ہر چیز کسی باشعور خالق نے تخلیق کی ہے اور یہ تخلیق ایک بہت ہی بڑی ارفع تخلیق کا ایک حصہ ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس حقیقت تک پہنچنے والے سائنسدانوں نے کھلے ذہن کے ساتھ کام کیا ہے اور انہوں نے Intelligent Design کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان سائنسدانوں کے سرخیل مائیکل جے بے Michal J. Behe نے ایک خالق کے مطلق وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اس حقیقت سے انکار کرنے والوں پر یوں تبصرہ کیا ہے:

''خلیے اور مالیکیول کی سطح پر حقیقت حیات پر ہونے والے کام نے واضح طور پر اور غیر مبہم انداز میں اپنے نتائج کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ نتیجہ اتنا اہم ہے کہ اسے بلاخوفِ تردید تاریخ سائنس کی سب سے اہم دریافت کہا جا سکتا ہے۔ اس دریافت پر دس ہزار حلقوں سے بیک وقت یوریکا یعنی پا لیا کا نعرہ بلند ہونا چاہئے۔

لیکن کسی قسم کا کوئی جشن نہیں منایا گیا۔ اس کی بجائے خلیے کی پیچیدگی پر ایک پراسرار خاموشی اختیار کر لی گئی ہے۔ جب یہی معاملہ عوام الناس کے سامنے لایا جاتا ہے تو صورتِ حال قبول کرنے میں قدرے دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ لیکن لوگ اپنی اپنی جگہ پر طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ واضح طور پر اس صورتِ حال پر اپنا مثبت رویہ اپنی حرکات وسکنات سے ظاہر کر دیتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے لئے صورتِ حال باعث اطمینان ہے۔ بالآخر سائنسی حلقے ان حقیقتوں کو قبول کرنے میں متامل کیوں ہیں۔ وہ زندگی کا شعوری تخلیق ہونا تسلیم کیوں نہیں کرنا چاہتے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ شعوری تخلیق تسلیم کرنے کی صورت میں انہیں خدا کو بھی ماننا پڑے گا''۔

آج بہت سے لوگوں کو شاید یہ خبر نہیں کہ خدا پر ایمان نہ لانے کی صورت میں انہیں متبادل میں جو کچھ ماننا پڑتا ہے وہ سائنس کے نام پر فقط مغالطہ انگیزی ہے۔ ایسے لوگ جو ''اللہ نے تمہیں لاشے سے پیدا کیا'' کو غیر سائنسی مانتے ہیں، یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ پہلی جاندار چیز کروڑوں سال پہلے ''تلچھٹ'' اور بجلی چمکنے کے نتیجے میں وجود میں آئی۔

جیسا کہ اس کتاب میں کہیں پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ فطری عوامل تعداد میں اتنے زیادہ

اور اتنے نازک طور پر متوازن ہیں کہ ان کا محض اتفاقاً یوں متشکل ہو جانے کو ماننا قطعی غیر عقلی طرزِ عمل ہوگا۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس غیر عقلی اور غیر منطقی طرزِ عمل سے نجات نہیں دلا سکتے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں زمین اور آسمانوں پر موجود اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ اللہ ہی نے آسمان اور زمین پیدا کیے اور وہ سب کچھ بھی جو ان کے درمیان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کی نشانیاں پوری کائنات پر محیط ہیں۔

NOTES

1. *Materylist Felsefe Sozulgu* (Dictionary of Materialist Philosophy), Istan-bul: Sosyal Yayinlar, 4th Edition, p.236
2. George Politzer, *Principes Fondamentaux de Philosophie*, Editions Sociales, Paris, 1954, pp.62-63
3. S. Jaki, *Cosmos and Creator*, Chicago: Regnery Gateway, 1980, p.54
4. *Stephen Hawking's A Brief History of Time: A Reader's Companion* (edited by Stephen Hawking; prepared by Gene Stone.), New York, Bantam Books, 1982, p. 62-63
5. George O. Abel, *Exploration of the Universe*, Holt Rinehart and Winston, 1975, pp. 665-667
6. Henry Margenau and Roy Abraham Varghese, eds., *Cosmos, Bios, Theos*, La Salle IL: Open Court Publishing, 1992 p.241
7. *Stephen Hawking's A Brief History of Time: A Reader's Companion* (edited by Stephen Hawking; prepared by Gene Stone.), New York, Bantam Books, 1982, p.143
8. W.R. Bird, *The Origin of Species Revisited*, Nashville: Thomas Nelson, 1991; originally published by Philosophical Library in 1987, p. 462
9. W.R. Bird, *The Origin of Species Revisited*, Nashville: Thomas Nelson, 1991; originally published by Philosophical Library in 1987, p. 405-406
10. Bilim ve Teknik magazine, vol. 201, p. 16
11. Stephen W. Hawking, *A Brief History of Time*, Bantam Books, April 1988, p.121
12. Paul Davies, *God and the New Physics*, New York: Simon & Schuster, 1983, p.189
13. Hugh Ross, Ph.D., *The Creator and the Cosmos*, Navpress, 1995, p. 76
14. Frederick Vester, *Denken, Lernen, Vergessen*, vga, 1978, p. 6
15. George Politzer, *Principles Fondamentaux de Philosophie*, Editions Sociales, Paris, 1954, pp.38-39-44
16. R.L. Gregory, *Eye and Brain: The Psychology of Seeing*, Oxford University Press Inc., New York, 1990, p.9
17. Lincoln Barnett, *The Universe and Dr. Einstein*, William Sloane Associate, New York, 1948, p.20
18. Orhan Hancerlioglu, *Dusunce Tarihi* (The History of Thought), Istanbul: Remzi Bookstore, 6.ed., 1995 September, p.447
19. V.I. Lenin, *Materialism and Empiriocriticism*, Progress Publishers, Moscow, 1970, p. 14.
20. Bertrand Russell, *ABC of Relativity*, George Allen and Unwin, London, 1964, p. 161-162
21. R.L. Gregory, *Eye and Brain: The Psychology of Seeing*, Oxford University Press Inc., New York, 1990, p.9
22. Ken Wilber, *Holographic Paradigm*, p.37
23. George Politzer, *Principes Fondamentaux de Philosophie*, Editions Sociales, Paris, 1954, p. 65.
24. Orhan Hancerlioglu, *Dusunce Tarihi* (The Historyof Thought), Istanbul: Remzi Bookstore, 6.ed., 1995 September, p. 261
25. George Politzer, *Principes Fondamentaux de Philosophie*, Editions Sociales, Paris, 1954, pp.65
26. Paul Davies, *God and the New Physics*, New York: Simon & Schuster, 1983, p.180-181

27. V.I. Lenin, *Materialism and Empiriocriticism*, Progress Publishers, Moscow, 1970, p.334-335
28. Alaettin Senel, "Evrim Aldatmacasi mi? Devrin Aldatmacasi mi?", (Non-Evolution of Deceit), *Bilim ve Utopya*, December 1998
29. *Mektubat-i-Rabbani* (Letters of Rabbani), Vol II, 357. Letter, p. 163.
30. *Mektubat-i-Rabbani* (Letters of Rabbani), Vol II, 357. Letter, p. 1432
31. Francois Jacob, *Le Jeu des Possibles*, University of Washington Press, 1982, p.111.
32. Lincoln Barnett, *The Universe and Dr. Einstein*, William Sloane Associate, New York, 1948, pp. 39-40.
33. Lincoln Barnett, *The Universe and Dr. Einstein*, p. 12.
34. Lincoln Barnett, *The Universe and Dr. Einstein*, p. 40.
35. Paul Strathern, *The Big Idea: Einstein and Realitivity*, Arrow Books, 1997, p.57.
36. Lincoln Barnett, *The Universe and Dr. Einstein*, p. 67.
37. Lincoln Barnett, *The Universe and Dr. Einstein*, p. 12.
38. Charles Darwin, *The Origin of Species: A Facsimile of the First Edition*, Harvard University Press, 1964, p. 189.
39. Derek A. Ager. "The Nature of the Fossil Record". *Proceedings of the British Geological Association*, vol. 87, no. 2, (1976), p. 133.
40. T.N. George, "Fossils in Evolutionary Perspective", *Science Progress*, vol.48, (January 1960), p. 1-3
41. Richard Monestarsky. Mysteries of the Orient, *Discover*, April 1993, p.40.
42. Stefan Bengston, *Nature*, 345:765 (1990).
43. Earnest A. Hooten, **Up From The Ape,** New York: McMillan, 1931, p.332.
44. Stephen Jay Gould, Smith Woodward's Folly, *New Scientist*, 5 April 1979, p.44.
45. Charles E. Oxnard, The Place of Australopithecines in Human Evolution: Grounds for Doubt, *Natura*, No.258, p.389.
46. Richard Leakey, *The Making of Mankind*, London: Sphere Books, 1981, p.116.
47. Eric Trinkaus, Hard Times Among the Neanderthals, *Natural History*, No.87, December 1978, p. 10, R.L. Holoway, "The Neanderthal Brain: What was Primitive?" *American Journal of Physical Anthrophology Supplement*, No.12, 1991, p.94
48. Ali Demirsoy, *Kalitim ve Evrim* (Inheritance and Evolution), Ankara: Meteksan Yayinlari, 1984, p. 61
49. Ibid.
50. *Fabbri Britannica Science Encyclopaedia*, Vol.2, No.22, p.519
51. Kevin McKean, No.189, p.7
52. Frank B. Salisbury, "Doubts about the Modern Synthetic Theory of Evolution", *American Biology Teacher*, September 1971, p. 336.
53. Ali Demirsoy, *Kalitim ve Evirm* (Inheritance and Evolution), Ankara: Meteksan Publishing Co., 1984, p. 39.
54. Homer Jacobson, "Information, Reproduction and the Origin of Life", *American Scientist*, January 1955, p.121
55. Reinhard Junker & Siegfried Scherer, "Entstehung Gesiche Der Lebewesen", *Weyel*, 1986, p. 89
56. Michael J. Behe, *Darwin's Black Box*, New York: Free Press, 1996, pp. 232-233.

عدم وجود سے مادّہ اور وقت کس طرح وجود میں آ گیا؟

کائنات کی تخلیق اور آغاز سے متعلق بگ بینگ تھیوری کیا ثابت کرتی ہے؟

صدیوں پر مشتمل وقت کا ایک ٹکڑا کیسے کسی اور جہان کسی اور جہت میں محض ایک لمحہ ہو جاتا ہے؟

قرآنی آیات اور آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت میں کس طرح مطابقت پائی جاتی ہے؟

یہ اور اس طرح کے تمام سوالات کا جواب اس کتاب میں ملے گا' جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مادّہ اور وقت مکمل حقیقتیں' حتمی سچائیاں نہیں ہیں بلکہ محض ادراکات ہیں۔

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اگر آپ خلا' مادّے' وقت اور تقدیر کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو یہ کتاب آپ کو ان دنیاؤں میں لے جائے گی۔

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز
E-mail: islamiat@lcci.org.pk idara@brain.net.pk